ایشیا

Narayan News Agency
Gulshan Restaurant, —
Opp; G. P. O.; 67. Fort Street;
BOMBAY 1.
ادبی مرکز ہند پبلشرز کا ماہنامہ
ایشیا
باتصویر
جولائی
اگست
مشترک نمبر
ادارہ
ذکیہ سلطانہ
ساغر نظامی
کورٹ رائل۔ کرائسٹ چرچ روڈ۔ بائیکلہ۔ بمبئی نمبر ۸
سالانہ چندہ
آٹھ روپیہ
ششماہی چندہ
پانچ روپیہ
قیمت فی پرچہ
بارہ آنے
"ایشیا" یونائیٹیڈ پبلشرز۔ این ڈبلو ریلوے کے ہر بک اسٹال سی مِل سکتا ہی

جولائی اگست مشترک نمبر

زیر نظر نمبر جون کے بعد شائع ہوا ہے لہذا اسے جولائی نمبر ہونا چاہئے لیکن ہماری مجبوریاں اور دوسرے اسباب اس نمبر کو "جولائی اگست مشترک نمبر" کی حیثیت میں پیش کر رہی ہے۔ اپنے معزز خریداروں کی طرف سے قرض کا جو بوجھ ہمارے کاندھوں پر بڑھتا جا رہا ہے اسے ہماری ندامتیں اچھی طرح محسوس کرتی ہیں۔ اور ہم ہر وقت سوچ رہے ہیں کہ یہ قرض کب اور کس طرح ادا ہو۔ ہم نہایت نامساعد حالات میں کام کر رہے ہیں اس لئے اس کے مستحق ہیں کہ ہماری مجبوریوں اور کوتاہیوں کو معاف کیا جائے۔

"ادارہ"

فہرست

ماہنامہ **ایشیا** باتصویر

مشترک نمبر

جلد (۱۰) بابت ماہ جولائی و اگست سنہ ۴۹ء نمبر (۵)

نئی صبح (مقالات)

ہزار داستان (افسانے)

نیا راگ (نظمیں اور غزلیں)

کسوٹی (تنقید و تبصرہ)

ستاروں سے آگے (فلم)

دی مغل لائن لمیٹڈ
(سب سے پرانی ہندستانی جہاز راں کمپنی)
مغل لائن نہایت مسرت کے ساتھ اس سال رمضان المبارک کے بعد حاجیوں کے چار جہازوں کی روانگی کا اعلان کرتی ہے۔
ایس، ایس، علوی۔ وزن ۳۵۶۶ ٹن (ایس، ایس خسرو کے بجائے) روانگی از بمبئی یکم اگست ۴۹ء
ایس، ایس، اسلامی — وزن ۵۸۷۹ ٹن — روانگی از بمبئی ۲ر اگست ۴۹ء
ایس، ایس، مظفری — وزن ۷۰۲۴ ٹن — روانگی از بمبئی ۳ر اگست ۴۹ء
ایس، ایس، جہانگیر — وزن ۳۵۶۶ ٹن — روانگی از بمبئی ۶ر اگست ۴۹ء
کرایہ معہ خوراک
بمبئی جدہ واپسی!
کرایہ درجۂ اوّل — ۱۱۰۵ روپیئے
عرشہ (ڈیک) — ۳۹۸ روپیئے
ان کرایوں میں کامراں قرنطائن کی فیس، حفظانِ صحت جدّہ کے محاصل اور کشتی کا کرایہ جن کی مجموعی رقم ۷۴ روپے ۱۲ر ہوتی ہے شامل نہیں ہے — عازمین حج کو آگاہ کیا جاتا ہے کہ وہ اس وقت اپنے گھروں سے روانہ نہ ہوں جب تک کہ کمپنی انھیں بمبئی آنے کو نہ لکھے۔ اس لئے کہ امسال حاجیوں کو لے جانے والے جہازوں میں تمام نشستیں محفوظ کی جا چکی ہیں۔
حاجیوں کو ان کے اپنے مفاد کے پیش نظر مشورہ دیا جاتا ہے کہ وہ ہیضہ اور چیچک کے ٹیکے اپنے وطن ہی میں لگوائیں اور اپنے ہاں کے محکمۂ صحت کے سرکاری افسر سے انٹرنیشنل فارموں پر تصدیق کرالیں۔
کوئی پیشگی رقم اسوقت تک روانہ نہ کی جائے جبتک کہ کمپنی اس کے بھیجنے کی درخواست نہ کرے۔
ٹرنر مارسین اینڈ کمپنی لمیٹڈ
مینیجنگ ایجنٹس:۔ دی مغل لائن لمیٹڈ، نمبر ۱۶ بنک اسٹریٹ، فورٹ بمبئی

انجمن ترقی پسند مصنّفین (بمبئی)

نازیوں کی انجمن

ایشیا مئی اور جون کے اداریوں کے جواب میں انجمن ترقی پسند مصنّفین کے ارکان آخر انتقام اور مغالطہ کے اس پست ترین درجہ پر اُتر آئے جو جمہوری اطوار اور ادیبانہ اخلاق سے قطعی بعید ہے۔ ۳ر جولائی ۴۹ء کو اپنے ہفتہ وار جلسے میں ترقی پسندوں نے کذب و افترا، الزام و تہمت، دشنام طرازی و امن سوزی اور مدیر ایشیا کو بے عزت کرنے کی کوئی صورت اُٹھا نہیں رکھی۔ یہاں تک کہ بھرے جلسے میں حملہ کرنے کی کوشش کی گئی اور اگر میری قوتِ برداشت جواب دے جاتی تو خون خرابہ ہو جانے میں کچھ دیر نہیں رہ گئی تھی۔

آئیے آپ کو بمبئی کے ترقی پسند ادیبوں اور "انقلابی پیغمبروں" کے اخلاق و اعمال کا ایک منظر دکھائیں، یہی وہ لوگ ہیں جو خود کو سماج و انسانیت کا اجارہ دار سمجھتے ہیں۔ جو مساوات و اخوت اور فکر و عمل کی آزادی کے مدّعی ہیں اور جو دن رات آزادئ تقریر و تحریر اور جمہوریت کے نفاذ کا ڈھول پیٹتے ہیں۔ ان ترقی پسندوں کے مہذّب جلسے کی مفصل روداد بیان کرنے سے قبل یہ بتا دینا ضروری ہے کہ پالیسی سے شدید بنیادی اختلاف انجمن سے میری علیحدگی کا اہم معنی ہے۔ میں نے مینی فسٹو پر دستخط نہیں کئے۔ مجھے عام طور پر ان کے غیر مہذب رویّے سے اتفاق نہیں تھا۔ ان کی پالیسی اور طریق کار سے میرا اختلاف شروع ہو گیا تھا۔ میں نے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا کہ انجمن پر غیر سنجیدہ پارٹی باز عناصر چھا چکے ہیں اور وہ کنکھجورے کے مانند ادب کے لطیف پیکر سے چمٹے ہوئے ہیں وہ اسے کھا کے چھوڑیں گے۔

انجمن کی ہیئتِ ترکیبی

انجمن میں تین گروہ ہیں — (۱) ایک وہ جو کمیونسٹ پارٹی کے آئینی و غیر آئینی ارکان پر مشتمل ہے اور انجمن کو رنگا رنگ حکمت عملیوں کے ماتحت چلانا اپنا حق سمجھتا ہے۔ اس لئے کہ اصل میں انجمن اُسی کی ہے۔ یہی گروہ انجمن کا کرتا دھرتا ہے اور انجمن کے زیادہ تر عہدے اُسی کے پاس ہیں!

(۲) دوسرا گروہ وہ ہے جو جماعت بندی کے مادّی و اجتماعی فائدوں کی اہمیت جانتا ہے۔ اس گروہ میں وہ افراد بھی شامل ہیں جن کی ذہنیت، طریق معاش،.... رہن سہن کا معیار اور ساری زندگی قطعی سرمایہ دارانہ ہے لیکن فیشن کے طور پر وہ "انقلابی" اور ترقی پسند ادیب بنتے ہیں۔

ظاہر ہے، بمبئی جیسے تجارتی شہر میں اس قسم کا "اسٹنٹ" تجارتی فروغ کے لئے ضروری ہے۔

(۳) تیسرا گروہ ان افراد کی اقلیت پر مبنی ہے جو بہر حال ایک ادبی ماحول چاہتے ہیں۔ کہیں بیٹھیں، روح و دماغ کو کوئی غذا ملے، اور اس طرح تربیتِ ذہن کا کچھ امکان پیدا ہوتا رہے۔ اس گروہ کے افراد ترقی پسندی کو محدود نہیں سمجھتے وہ ترقی پسندی کو جاوداں اور ادب کی قدروں کو اَبدی سمجھتے ہیں۔ وہ سیاست کو ادب سے علیحدہ نہیں سمجھتے .... لیکن.... سیاست تک ادب کو محدود نہیں کرتے۔ ان میں کئی تشدّد کے ذریعے انقلاب کے قائل نہیں۔ اور کئی کے ذہن میں انقلاب کی مختلف توجیہیں ہیں۔ ان میں سے بعض سوشلسٹ ہیں، بعض قوم پرست، بعض محض مسلمان اور بعض محض ہندو۔ لیکن ان سب کی شرکت کی وجہِ مشترک محض "ادب" ہے کیونکہ بمبئی میں کوئی دوسرا ایسا ادارہ موجود نہیں ہے جس میں وہ شریک ہو سکیں، اس لئے ماحول میں دھند کے باوجود وہ انجمن میں شریک ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ محض دھواں ہے چھٹ جائیگا۔ لیکن یہ دھواں نہیں گھنگور بادل ہے جو اس گروہ کو چاروں طرف

سے گھیر لیتا ہے اور اس میں کڑکنے والی بجلیاں اس گروہ کی آواز کو دبا دیتی ہیں۔

لہٰذا یہ اقلیتی گروہ ایک مجبور اور مفلوج گروہ ہے جس بیچارے کا فرض تجویزوں پر ہاتھ اُٹھانا اور بیٹھے بیٹھے گردن کو تائیدی جھٹکے دینا ہے۔ یہ گروہ افسوسناک طور پر کمزور اور بے حس گروہ ہے۔ ترقی پسندوں کی غلط رَوی اور کھلی سازش پر بھی اس میں احتجاج کی ہمّت پیدا نہیں ہوتی۔ اے کاش اس گروہ کے افراد اپنی عظمت اپنی قوت اور ادب میں اپنا مقام محسوس کرتے۔ کاش یہ اس حقیقت کو سمجھ جاتے کہ ان نام نہاد ترقی پسندوں نے ہمیشہ ایسے "سکوں گذار ادیبوں" کو اپنا حاشیہ بردار بنانے سے زیادہ وقعت نہیں دی ہے۔

سب کچھ جانتے ہوئے اس گروہ کے افراد انجمن کی نسطائیت دھڑے بندی، لفّاظی، غلط حکمت عملی غرضکہ ہر اقدام کو برداشت کرتے ہیں اور ان میں سے کوئی بڑھ کر یہ نہیں کہتا کہ اس طرح کسی عوامی ادارے کو چند خود غرض اور شہرت طلب افراد کی جاگیر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

جس جلسے میں اس گروہ کا کوئی فرد بولنا چاہتا ہے تو اُٹھکر چند مخصوص لوگ تالی پیٹ دیتے ہیں۔ جو جلسے میں صرف اسی لئے بٹھائے جاتے ہیں۔

انجمن کا امن سوز جلسہ

چنانچہ ۳ر جولائی ۴۹ء کو ہونے والا جلسہ بھی کچھ اسی قسم کا جلسہ تھا جس کے انعقاد سے پہلے مجھے اطلاع دی گئی تھی کہ "آیشیا" میں انجمن کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے ہم اس کا جواب دے کر اپنی پوزیشن صاف کرنا چاہتے ہیں:

چنانچہ میں جلسے میں گیا لیکن اس جلسے میں پوزیشن صاف کرنے اور میرے اعتراضات کا جواب دینے کے بجائے اس قسم کے مضامین پڑھے گئے جس میں یہ بتایا گیا کہ میں عوام کا دشمن ہوں۔

جلسے میں اِدھر اُدھر، دائیں بائیں ہر سمت باقاعدہ مورچے بنائے گئے تھے۔ یہ راز اس وقت کھلا جب سب سے پہلے انجمن کے متعلق میرے لکھے ہوئے دونوں اداریے جلسے میں پڑھے گئے اور چاروں طرف سے ایک ساتھ مجھ پر ہلّہ بولا گیا۔

گالیاں، تالیاں، آوازے، ٹھٹھے، سیٹیاں، تبرّا غرضکہ کسی پست سے پست اور ذلیل سے ذلیل بات کہنے سے تکلّف نہیں کیا گیا۔ کیفی، عصمت اور عادل نے باقاعدہ حاضرین کو بھڑکایا کہ میں عوام کو جاہل سمجھتا ہوں، غاصب ہوں، لٹیرا ہوں، سرمایہ پرست ہوں، بلیک میلر ہوں، موقع باز ہوں، سرکاری آدمیوں کی چوکھٹ پر سر رگڑتا ہوں، ایس کے پاٹل کے جلسوں میں جاکر "آیشیا" بیچتا ہوں، پٹا ہوا مُہرہ ہوں، ترقی پسندی کا دشمن ہوں، رجعت پسند ہوں ایک الگ انجمن بنانا چاہتا ہوں، ترقی پسندی کو نقصان پہونچا رہا ہوں، حکومت کا آدمی ہوں، جلبِ منفعت کرتا ہوں، یہ اور اسی قسم کے سینکڑوں غیر مہذب اور بے بنیاد الزامات، شور و شر، تبرّا اور تمسخر اور لعن طعن کا ایک طوفان تھا اس جلسے میں۔ انجمن کے فیسسٹ ارکان جو جی میں آرہا تھا کہہ رہے تھے اور اپنے علاوہ کسی دوسرے کی سننے کے لئے تیار نہ تھے، میرے بولنے پر "ہم کچھ نہیں سُننا چاہتے" کا شور مچایا گیا اور جن اصحاب نے میری طرف سے بولنا چاہا انھیں بولنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

یہ تمام طوفان اخلاق و تہذیب اور ادیبوں کی روایات کے قطعی خلاف تھا لیکن یہ طوفان ترقی پسند ادیبوں نے اختیاری طور پر اُٹھایا تھا۔

باقاعدہ حملے کی کوشش

ایک ترقی پسند شاعر مجھ پر حملہ آور ہونا چاہتے تھے، کئی آدمی انھیں پکڑ پکڑ لیتے تھے، مگر وہ انگریزی میں گالیاں بک رہے تھے اور گھونسہ تان کر مجھ پر ٹوٹ پڑنا چاہتے تھے ایک ادبی جلسے میں یہ "غنڈہ ازم" شاید "انشا اور مصحفی" کے زمانے میں بھی روا نہ رکھا گیا ہوگا۔ ایک شخص کو جلسے میں بلانا، پھر اُسے گالیاں دینا اور دوسروں سے دلانا حاضرین کو غلط تاویلات سے بھڑکانا، خود ہر جائز و ناجائز باتیں کہنا اور وہ غریب کچھ کہنا چاہے تو اس کا ہوٹنگ کرنا، اس پر حملہ آور ہونا۔ شاید یہی وہ جمہوری طریقہ ہے جو ملک میں عوامی انقلاب لائیگا، جو عوام کو اونچا کرے گا، جو انسانیت کی نئی جنّت بسائیگا۔!؟

آخر تنگ آکر میں نے اعلان کیا کہ آپ لوگوں نے ناقابلِ برداشت بدتمیزی کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور میں ایسی انجمن میں رہنا اپنی توہین سمجھتا ہوں جس کے نام نہاد ۔۔۔۔۔۔ افراد اس قسم کی بدتمیزی روا رکھیں۔

اس کے بعد وہ تجویز پاس کی گئی جس میں انجمن کی طرف سے مجھے باقاعدہ علیحدہ کیا گیا ہے اور جس کا عنوان یہ قائم کیا گیا ہے۔

موقع پرستوں کے لئے انجمن میں کوئی جگہ نہیں

جہاں تک موقع پرستی کا تعلق ہے۔ میری موقع پرستی تو اسی سے ظاہر ہے کہ جب ترقی پسند ادیب ۱۹۴۲ء کی تحریک آزادی کے خلاف کام کر رہے تھے میں ان کی تائید نہیں کرتا تھا۔ اس کے بعد انھوں نے مسلمانوں پر اپنی سیاست کا اثر جمانے کیلئے نیشنل کانگریس، قوم پرست مسلم سوشلسٹ پارٹی، فارورڈ بلاک غرضکہ ہر قوم پرست جماعت اور تمام ہندوستانی عوام کی مرضی کے خلاف تقسیم ہند کی تائید میں ادب پیدا کرو کا نعرہ بلند کیا، اسوقت بھی میں نے ان کی تائید نہیں کی حالانکہ اس وقت میری تائید کے معنی کروڑوں مسلمانوں کی پشت پناہی کے تھے۔

اپنے سیاسی مقاصد کی تکمیل کے لئے انجمن کے غالب گروپ نے اینٹی فیسسٹ تحریک کے نام پر انگریزوں کی جمہوریت نوازی کے گیت گائے، برطانوی روسی اتحاد کے پیش نظر ہر ناجائز کو جائز کر لیا۔ میں نے اسوقت بھی اُن کی تائید نہیں کی۔

مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ سجاد ظہیر نے مجھ سے کہا "آپ اور ہمارے تمام انقلابی شاعر شدید جمود میں مبتلا ہیں، ایسا کیوں ہے؟" میں نے جواب دیا، انگریزوں کی فسطائیت دشمنی سیاست کا سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ یہ جھوٹ نفرت کی اس آگ کو بھڑکاتا ہے جو ان کی انسانیت دشمن پالیسی نے ہمارے دلوں میں لگا رکھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نظریاتی بنیاد وہی مگر تخلیق کے لئے جس تپش کی ضرورت ہے وہ انگریزوں کے نام پر ہمارے دلوں میں پیدا نہیں ہوتی۔

۱۵ اگست سے پہلے پہلے ترقی پسند ادیب ماؤنٹ بیٹن پلان کی سخت مخالفت کرتے رہے لیکن یکایک ملہم غیبی کی صدا سن کر اُن کی جدوجہد کا رُخ تبدیل ہو گیا اور انھوں نے ۱۵ اگست کو ہندوستان کا "جشنِ آزادی" منایا، سڑکوں پر ناچتے اور جاگیرداروں کو نچاتے ہوئے نکلے۔

اس کے بعد یکایک انھیں الہام ہوا کہ اُن سے غلطی ہوئی ہے۔ آزادی کو پہچان نہیں سکے، اور یکایک انھیں آکاش وانی ہوئی کہ پاکستان کی تائید میں ان کی جدوجہد غلط تھی، پاکستان کے قیام سے جو امیدیں تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں، اب کوئی صحیح بات ہونی چاہئے۔ اس قسم کی غلطیاں کرنے اور انھیں تسلیم کرنے میں ہمارے ترقی پسند دوست اعلیٰ درجہ کی مہارت رکھتے ہیں۔

ان مختلف غلطیوں کو اگر تسلسل کے ایک رشتہ میں پرو کر دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ترقی پسندوں نے ادب کو ایک خاص منفی سیاست کی باربرداری کا خچر بنائے رکھا جس پر "موقع بازی" ہر عہد میں سواری کرتی رہی۔

انجمن کی تجویز غلط الزامات اور بے سروپا ہفوات سے بھری ہوئی ہے۔ اس میں وہی ناتسی عنصر کام کر رہا ہے جسکی طرف میں اشارہ کر چکا ہوں، جس کے خلاف ہندوستان کے متعدد ادیبوں کے خطوط ایشیا میں شائع ہو چکے ہیں۔ جن میں انجمن کے غیر ذمہ دار افراد کے طریق عمل سے بیزاری اور ناخوشی کا اظہار کیا گیا ہے۔

بہر حال تجویز میں لگائے ہوئے الزامات پر تفصیلی گفتگو سے پہلے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ یہ میرے عمل اور ذات پر قطعی اثر انداز نہیں ہوتی۔ اور نہ میں اسکو اہمیت دیتا ہوں، اس لئے کہ ادب، ملک، اور انسانیت کی خدمت کے لئے کسی انجمن کی عہدہ داری اور شرکت ضروری نہیں ہے۔ اور یہ تجویز تو اس لئے اور بھی بے اثر ہو جاتی ہے کہ بد دیانتی اور بد نیتی اس کی بنیاد ہے۔

بنیادی سوال "پالیسی"

انجمن کے ارکان نے بنیادی سوال سے چشم پوشی کی ہے بنیادی سوال "میری تہمت تراشی"، "تنقید و احتساب کا امتیازی فرق"، "نوجوان ادیبوں کی حقارت"، "انجمن کو بے اثر کہنا"، "ساغر نظامی کی انفرادیت پرستی اور خود پسندی"، "کمیونسٹ دشمنی اور کمیونسٹ دوستی"، "ترقی پسند خیالات کی دشمنی"، "ترقی پسند تحریک کے ساتھ غداری" اور اسی قسم کے طفلانہ اتہامات سے بے تعلق ہے۔ سوال انجمن کی پالیسی کا ہے جس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا اور جو آج بھی تشنہ ہے۔

میں نے مئی ۱۹۴۹ء کے ایشیا میں ایک جلسہ کی روداد لکھتے ہوئے تحریر کیا تھا۔

"انجمن کے کمیونسٹ ارکان کے علاوہ مخالف سیاسی عقیدہ رکھنے والے ممبروں کی انجمن میں کیا

پوزیشن ہے۔ سیاسی اختلافات کے باوجود کونسا
وہ درمیانی نقطہ ہے جس پر کمیونسٹ گروپ اور
باقی دوسرے ممبر متحد اور مجتمع ہو سکتے ہیں؟
اور اگر قوم پرست اور سوشلسٹ خیال کے
ادیبوں کی کوئی آواز انجمن میں نہیں ہے اور وہ اپنے
اختلافات کو کامیاب نہیں بنا سکتے تو ان کے لئے آپ
کی جمہوریت نوازی نے کیا راستہ اختیار کیا ہے کہ
وہ بھی انجمن سے اپنی رائے منوا سکیں۔"

تجویز میں لکھا گیا ہے۔

"ساغر سمجھتے ہیں کہ عقل و فراست اور سمجھ بوجھ صرف
انھیں کے حصّے میں آئی ہے اور انجمن کے دوسرے ممبر آنکھیں بند
کئے بے وقوفوں کی طرح دوسروں کے پیچھے چلتے ہیں۔ ان کے خود
اپنے کوئی خیالات نہیں وہ کور دماغ ہیں اور صرف ساغر روشن دماغ!"
یہ طریق فکر اس تجویز کے مصنفین ہی کو مبارک ہو۔ میں ایسا
نہیں سمجھتا۔ ہر شاعر اور ادیب کی میرے دل میں عزت ہے، یہ سب
عقل و فراست رکھتے ہیں، ہرگز کور دماغ اور بے وقوف نہیں۔ ساغر
نظامی کی طرح انجمن کے ڈکٹیٹروں سے ٹکر لیتے ہیں، اور بعض مرنجا
مرنج ہیں اور آپکے گٹھ جوڑ سے گھبراتے ہیں۔ لیکن بنیادی سوال
یہ ہے کہ انجمن کی پالیسی میں نظریاتی تضاد ہے۔ آخر آپ اسکا کیوں جواب
نہیں دیتے کہ موجودہ بکھرے ہوئے سیاسی مسائل کے متعلق قوم
پرستوں، سوشلسٹوں، لیگیوں، سوشلسٹ ریپبلکن اور کانگرسیوں
کے نظریات اور عمل ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن یہ مختلف
نظریات و عمل رکھنے والے کس مشترک اصول پر انجمن کے ممبر ہو سکتے
اور اس میں رہ سکتے ہیں؟

انجمن کا ماضی میں جو رول رہا ہے ظاہر ہے۔ موجودہ زمانے
میں بھی اس کا رول حالات کے مطابق نہیں، دلچسپ بات یہ ہے
کہ اگر اُسے خالص اشتراکی رول بھی مان لیا جائے، تب بھی زبردست
سوال ہوتا ہے کہ "اشتراکی" سے اُن کی کیا مراد ہے؟ کیونکہ ملک میں کئی
اشتراکی پارٹیاں ہیں۔ رائسٹ ہیں، سوشلسٹ ریپبلکن ہیں اور
خود سوشلسٹ جماعت ہے جو اشتراکی نظام ہی کے لئے جدوجہد
کر رہی ہے، لیکن انجمن ان سب کو بھی میری طرح "غدار" کہتی ہے۔ اب
اگر ان "غداروں" میں سے کوئی ترقی پسند ادب کا شیدائی سوشلسٹ
انجمن میں شریک ہونا چاہے تو وہ کس طرح آپ کی صفوں میں بیٹھ
سکتا ہے۔ آپ ریلوے ہڑتال کی تائید میں، وہ ہڑتال
کی تردید میں!؟

۲۴ گھنٹے کے اندر آپ ترقی پسندی کے سانچے میں ایک پالیسی
ڈھالتے ہیں کہ شعراء ہڑتال کی تائید میں نظمیں کہیں۔ یہاں سوال
پیدا ہوتا ہے کہ ایک سوشلسٹ شاعر نیاز حیدر کی طرح جے پرکاش
نرائن کو کس طرح گالیاں دے!؟ وہ اپنے سیاسی عقیدے کی بنا پر گالی نہیں دیگا۔
لیکن اگر وہ آپ کی انجمن سے وفادار رہنا چاہتا ہے تو اسے اپنے
ضمیر کے خلاف گالی دینی چاہئے، ورنہ آپ تو غداری کا سارٹیفکٹ
دینے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔

یہ اور دوسرے سماجی و سیاسی مسائل میں انجمن نے
ایک عجیب پالیسی اختیار کی ہے۔ جس کی قومی حیثیت نہ ہونے کے
برابر ہے لیکن بین الاقوامی ضرورتوں اور مسائل سے بھری ہوئی ہے۔ آپ
اپنے گھر کی آگ بجھانے کے لئے تیار نہیں لیکن سمندر پار کے ملکوں
میں فائر بریگیڈ لے کر بھاگ رہے ہیں۔ ایک محب وطن اس
طریق کار کی موجودگی میں کس طرح آپ سے اشتراک کر سکتا
ہے؟

ادیبوں شاعروں اور کسی ملک کے دانشوروں کی انجمن اپنے
بہت کچھ فرائض رکھتی ہے، علم و ادب میں پارٹی سیاست سب سے
بڑا گناہ ہے۔ لیکن انجمن ترقی پسند مصنفین کی طرف سے مسز سروجنی نائیڈو کی
موت پر تعزیتی تجویز اسی لئے پاس نہیں کی گئی کہ وہ قوم پرست تھیں
اور کانگریس حکومت کی گورنر!؟

مسز نائیڈو سے پہلے ڈاکٹر سید حسین کی موت پر بھی کوئی
اظہار عقیدت و غم نہیں کیا گیا کیونکہ وہ موجودہ کانگرسی حکومت
کے سفیر تھے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ یہ دونوں شخصیتیں بین الاقوامی
حیثیت کی ادیب اور دانش ور تھیں۔ دونوں ہستیاں قومی اور انسانی خدمات کے
لحاظ سے بلند مرتبہ رکھتی تھیں خاص کر مسز سروجنی نائیڈو جو خود شاعرہ و ادیب تھیں اور ادب کی سرپرست بھی
........، بعض
نازک موقعوں پر انھوں نے کمیونسٹ پارٹی کی علانیہ حمایت کی
لیکن ان کے ساتھ بھی انجمن کے ڈکٹیٹروں نے شدید ناانصافی
اور تنگ دلی کا ثبوت دیا۔

پھر یہ ایک ادبی انجمن کب ہوئی، یہ تو ایک جانبدار
سیاسی انجمن ہوئی جس کی بنیاد مسلمہ ادبی قدروں پر نہیں بلکہ

سیاسی جماعت بندی پر ہے۔!؟

اس صورتِ حال کو مختلف خیال کے لوگ کیونکر برداشت کرسکتے ہیں۔ یہ بہت بڑا سوال ہے؟ آپ لوگوں کو اپنی انجمن سے خارج کرتے ہیں حالانکہ آپ کے عمل کا دائرہ خود اس درجہ تنگ ہے کہ آدمی کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ آپ سے علیحدہ ہوجانے کے لئے مجبور ہوجاتا ہے۔ یہ آپکی فتح نہیں شکست ہے۔

کمیونسٹ خطرہ کا الارم بجانے سے مجھے کوئی تعلق نہیں، میں انجمن کے ان ارکان کی طرح بزدل نہیں جو اپنے رسالے پر اپنا نام و پتہ نہیں دیتے ہیں۔ میں ایمانداری سے یہ کہتا ہوں کہ آپ صاف صاف سامنے آئیے۔ اور اعلان کیجئے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین ایک مخصوص خیال کے ادیبوں کی انجمن ہے۔ اس کے بعد کوئی اعتراض باقی نہیں رہتا۔ لیکن جب تک مختلف عقیدے کے لوگ اس میں رہیں گے وہ انجمن کی پالیسی پر اپنے نقطۂ نگاہ سے معترض ہوتے رہیں گے اور آپ ان کے خلاف تجویزیں پاس کرکے انھیں نکالتے رہیں گے، نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ "پانچ" ہی رہ جائیں گے جن کی طرف تجویز میں اشارہ کیا گیا ہے۔ میں ترقی پسند تحریک کا دشمن نہیں، البتہ وہ لوگ سب سے بڑے دشمن ہیں جو انجمن پر نازیانہ غلبہ رکھتے ہیں۔

تجویز میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ:-

"جون کے پرچے (ایشیا) میں انھوں نے ایک مشہور ادیب کا خط جن کا نام دینا مناسب نہیں سمجھا گیا شائع کیا جس میں ساغر صاحب کو دعوت دی گئی ہے کہ "ہم غیر اشتراکی ترقی پسند ادیب بڑی سنجیدگی سے سوچ رہے ہیں کہ ہمیں الگ اک انجمن بنانا پڑے گی۔ ممکن ہے کہ اس سہ ماہی کے اندر ہی آپ کے پاس اس طرح کے جلسہ میں شرکت کا دعوت نامہ جائے۔"

انجمن ترقی پسند مصنفین کے مقابلے میں ایک دوسری جماعت بنا کر ساغر اُن لوگوں کو مدد پہونچا رہے ہیں جو ترقی پسند خیالات کے دشمن ہیں، جو پُرانے سڑے گلے نظام کو باقی رکھنا چاہتے ہیں اور اس لئے ترقی پسندوں پر شدت سے حملے کرتے ہیں اور اس طرح ساغر ترقی پسند تحریک کے ساتھ غداری کر رہے ہیں۔"

ترقی پسند مصنفین کو اس خط سے سبق لینا چاہئے۔ تمام ملک ان سے نالاں ہے۔ اس خط کے مطالب و مقاصد ان کی حکمت عملی کا ردِّ عمل ہیں۔ آج ہندوستان کے اُن مشہور ادیبوں اور دانشوروں کی اکثریت نئی ترقی پسند انجمن بنانے کا فیصلہ کرچکی ہے جن کی خاک سے ترقی پسند پیدا ہوئے ہیں۔

مقابلے کی جماعت میں نہیں بنا رہا ہوں، یہ شدید غلط بیانی ہے بلکہ یہ خیال سماجی ضرورتوں کے بطن سے پیدا ہوا ہے۔ اور وہ اہل افراد اس خیال کو عملی شکل دینا چاہتے ہیں۔ جہانتک میرا تعلق ہے جب تک میں نئی انجمن کی پالیسی اور مقاصد سے واقفیت حاصل نہ کرلوں۔ اس کی تائید و تردید میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

نئی انجمن بنانے کا خیال ملک میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بے اثری کی دلیل ہے اس سے مشہور ادیبوں کی بے تعلقی ترقی پسندوں کی مطلق العنانی اور اردو ادب میں انجمن کی غیر نمائندہ حیثیت صاف آشکار ہوجاتی ہے۔

ترقی پسندی کی اجارہ داری

اگر فرصت ہو تو اس مسئلہ پر ایک مبسوط کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ کس قدر غلط تصوّر ہے ترقی پسندی کی اجارہ داری کا!؟ اگر اِن لوگوں کا طریقِ فکر ذرا سائنٹفک ہوجائے اور یہ جماعت بندی سے آزاد ہوکر خلوص کے ساتھ غور کریں تو بہ آسانی اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ترقی پسندی کسی خاص دماغ کی اُپج نہیں ہے بلکہ وہ تو ہمارے پورے عہد کی پیداوار ہے۔ ہر انسان کے ذہن پر اپنے عہد کے پَرتو پڑتے ہیں اور نت نئے طریقوں سے پڑتے ہیں۔ ترقی پسند مصنفین کا یہ کہنا کہ ترقی پسندی ان کی مانوپلی ہے۔ سخت نادانی ہے۔ تحریک کرشن چندر، عصمت اور ان کے ساتھیوں کی کوئی موروثی جاگیر نہیں ہے۔ وہ تو ہمارے زمانے کا فیضان ہے اور اپنے کیف و کم کے لحاظ سے ذہنوں تک پہونچ رہا ہے۔ اس لئے دوسروں کو ترقی پسند خیالات کا دشمن کہنا، اور یہ کہنا کہ وہ پُرانے گلے سڑے نظام کو باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ ایک سستا جماعتی پروپگنڈا ہے۔ محض لفّاظی ہے۔ یہ لفّاظی کرتے وقت ان میں سے اکثر کو سوچنا چاہئے کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔؟ اُردو زبان کو دوسری زبانوں کے ہم پلّہ کرنے والے ادیبوں میں اقبالؔ، حسرتؔ

جوشؔ، جگرؔ، نیازؔ، پریم چند، سجّاد حیدر، رشید احمد صدیقی، علی عباس حسینی، غلام السیّدین، آل احمد سرور، اور اردو کے سینکڑوں ادیب وشاعر ترقی پسندی کے دشمن ہیں یا بانی مبانی!؟ ان سب نے انحطاط اور زوال کی نیند سے انسانیت کو چونکایا ہے، یا سلایا ہے؟؟ انھوں نے سڑے گلے نظام کی جڑیں ہلائی ہیں یا ان میں سیسہ پلایا ہے؟!؟

اگر ان میں سے ایک شخص کو پیش کر دیا جائے تو ترقی پسندوں کو اپنی گفتار وکردار کا تضاد محسوس ہو جائے۔

یہ ذرا سوچیں کون پُرانے سڑے گلے نظام کو باقی رکھنا چاہتا ہے کیا وہ جو شب وروز سرمایہ داروں میں بسر کرتے ہیں یا وہ جو سرمایہ داروں سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتے۔ کیا وہ جنکی زندگی مزدوری اور ملازمت کرتے گزری یا وہ جو صبح سے شام تک فلم کمپنی قائم کرنے کیلئے فنانس کی تلاش میں در بدر پھرتے ہیں!؟ یہ نہیں تو کیا وہ پریشان اہل قلم جن کی تنخواہ دو سو سے زیادہ آمدنی نہیں، یا وہ رؤساء جو فلم انڈسٹری سے ہر ماہ..... ہزاروں روپیہ وصول کرتے ہیں!؟

آخر اپنے کردار وعمل سے کون سڑے گلے نظام کو باقی رکھنا چاہتا ہے کیا وہ لوگ جو سمندر کے کنارے راجہ رانیوں کی طرح رہتے ہیں یا وہ لوگ جنھیں رہنے کے لئے بُرے مکان بھی نصیب نہیں۔ !؟!

نعرہ باز ترقی پسندوں کو معلوم ہونا چاہئے کہ نیا نظام محض الفاظ اور ہُو حق سے نہیں آ جائے گا، اس کے لئے کردار کی ضرورت ہوگی، تیاگ کی ضرورت ہوگی اور قربانی کی ضرورت ہوگی۔ یہ میں تسلیم کرتا ہوں کہ قربانی دینے والے ادیب ترقی پسندوں کی "عوامی" زندگی کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ماشاءاللہ ترقی پسند ادیب جن کے دل محنت کشوں کی ہمدردی سے لبریز ہیں، غریب مل مزدور کی دو ہفتوں کی تنخواہ ایک دن کے پٹرول میں پھونک دیتے ہیں۔ رات بالی کا مزدور جب پسینے میں نہایا ہوا مشینوں کے انبوہ میں جاگتا ہوتا ہے۔ یہ اپنے آرٹسٹک فلیٹوں میں برقی پنکھوں کی خنک موسیقی کے سہارے اسپرنگ دار مسہریوں پر آرام فرماتے ہیں!؟

ان کی روحیں ساہوکار ہیں، ان کے دماغ سرمایہ دار ہیں! ان کا لاشعور سونے چاندی کی اینٹوں کے سوائے کچھ نہیں سے شارک اسکن کی شروانی پھڑکاتے ہوئے جب یہ مزدوروں کا نام لیتے ہیں تو بیساختہ ہنسی آتی ہے۔

عام ذہن بہت کچھ اس تضاد کو معاف کرنا چاہتا ہے مگر جست کرکے یہ سوال ہونٹوں پر آ ہی جاتا ہے کہ اشتراکی اور ترقی پسند کے مستعار القاب انھیں زیب دیتے ہیں یا نہیں!؟ یہ منافق ہیں یا مخلص؟! یہ سماج کے غدّار ہیں یا وفادار!؟ یہ عوام کے نمائندہ ہیں یا وہ جن کے خلاف عوام کو بھڑکایا جاتا ہے، کہیں یہی تو اپنی دورُخی زندگی سے عوام کو دھوکہ نہیں دیتے!؟ اگر عوام غور کریں گے تو اس سوال کا جواب خود ان کی دورُخی زندگی میں مل جائے گا۔

دماغی توازُن کا فقدان

ترقی پسندوں کی تجویز کے لفظ لفظ سے ان کے دماغوں کا عدم توازن ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی باتوں میں کوئی منطق نہیں کوئی دلیل نہیں۔ یہ لوگ عوام کو احمق سمجھتے ہیں اور خیال کرتے ہیں...۔......... کہ ان کا فرمایا ہوا گویا آیت وحدیث ہے عوام اپنی عقل وخرد کو طاق میں رکھ کر فوراً اس پر ایمان لے آئیں گے۔!؟

یہ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں تنقید کو برداشت نہیں کر سکتا حالانکہ ان کے سہ ماہی طرزِ عمل سے ثابت ہوتا ہے کہ جرمنی کے نازیوں کی طرح یہ بولنے والوں کی زبان بند کر دینا چاہتے ہیں۔ اپنے نظام کا دباؤ ڈال کر افراد کی فکر وعمل کو مسلوب کر دینے کی کوشش کرنا اوّل درجہ کی نازیت نہیں تو کیا ہے۔ یہ ناقابلِ برداشت ظلم ہے کہ ادب کی دنیا سیاسی پروپگنڈے کی ایک خاص تکنیک میں جکڑ دی جائے، جو شخص زبان کھولے اُسے ہٹلر اور عوام دشمن کہا جائے اور جو ان نازیوں کے سامنے سپر انداز ہو جائے اُسے سر پر بٹھایا جائے!؟

قابلِ رحم دیوانہ پن

اپنی تجویز میں پروردۂ جبر ترقی پسندوں نے مجھ پر دو اوچھے وار کئے ہیں ــــــ مگر یہ اوچھے وار مجھ پر اثر انداز نہیں ہوتے، میرے جسم پر اُن واروں کی ہلکی سی خراش بھی نہیں، اگر تجویز کے مصنف غور کریں گے تو انھیں اپنے واروں کے زخم

خود اپنے دل میں نظر آئیں گے۔ تجویز میں لکھا گیا ہے کہ:۔

"جب ۔ ساغر نظامی اس سوال کا جواب نہ دے سکے تو توہم پرست کی طرح انھوں نے بھی سرخ خطرے کا الارم بجایا اور کہا، ترقی پسند مصنفین کی انجمن اکثر کی رائے میں کمیونسٹ پارٹی کی حکمت عملی کے ساتھ ساتھ اپنی حکمت عملی بناتی اور بگاڑتی رہی ہے۔ انجمن صرف چند لوگوں ۔۔۔ (جعفری ممتاز، مہدی، کیفی اور عادل) کی اجارہ داری میں ہے۔ یہ لوگ اپنی تگڑم سے جو چاہتے ہیں منوا لیتے ہیں۔

ساغر نظامی غالباً یہ بھول گئے کہ کمیونسٹ دشمنی کا ہتھیار بہت کند ہو چکا ہے۔ آج سے کئی برس پہلے ہٹلر نے بھی یہی ہتھیار استعمال کیا تھا تاکہ اس سرخ خطرے کے نام پر اپنی من مانی کر سکے۔ اس کا انجام معلوم؟"

یہ الفاظ پڑھ کر ادب کی کس مپرسی پر سرپیٹ لینے کو جی چاہتا ہے۔ ان لوگوں نے علم و ادب کے مسائل کو بازیچۂ طفلاں بنا دیا ہے۔ یہ ایک ادبی انجمن کی تجویز کا ٹکڑا ہے جس میں لکھا جا رہا ہے کہ اگر ہم سے اختلاف کرو گے تو تمہارا حشر بھی خودکشی اور قتل کی صورت میں ہوگا۔!؟

یہ تجویز کے نام نہاد مصنفین کا قابلِ رحم دیوانہ پن ہے جب سڑکوں پر ننگ دھڑنگ دیوانے امن پسند راہگیروں پر پتھروں کی بارش کرتے ہیں تو غصہ نہیں رحم آتا ہے، کیا کریں؟ قدرت نے اُن بے چاروں کو عقل و خرد سے محروم پیدا کیا، اپنی خِلقی دیوانگی سے مجبور ہیں ہوش ہی نہیں۔ اسی طرح مجھے اپنے اُن دوستوں پر رحم آتا ہے جنہوں نے اتہامات کی اس فہرست کو تصنیف کیا ہے۔

میں ان جان لیوا دھمکیوں سے نہیں ڈرتا۔ یہ فضول سی باتیں ہیں۔ کمیونسٹ دشمنی یا کمیونزم دوستی کا سوال ہی نہیں ہے" سوال ایک ملک میں ادب کے طے شدہ راستے کا ہے۔ بنیادی اصول کا ہے۔ اس کا جواب پڑھے لکھے لوگوں کی طرح دینا چاہئے۔

یہ درست ہے کہ ادب و سیاست کا ساتھ ہے لیکن آج اگر ادب میں فکر و احتیاط سے کام نہیں لیا گیا تو ہمارا ادب مر جائے گا۔ کوئی عظیم الشان تخلیق نہیں ہو سکے گی۔ ادب اور شاعری کوئی میکانکی چیز نہیں ہے اگر ادب کو سیاسی حکمت عملیوں کے ہاتھ کا کھلونا بنا دیا گیا تو صداقت کا عنصر قطعی فنا ہو جائے گا۔ ہمارا تمام شعر و ادب نعرہ بازی بن کر رہ جائے گا۔ مجھے کسی پارٹی اور اس کے اصولوں سے کد نہیں۔ صحت مند طریقے سے جس قدر خارجی عناصر اپنے قدرتی فعل کے ساتھ اک داخلی کیفیت بن سکیں ادب کی ترقی میں مدد دیں گے؛ لیکن یہ عمل ہوحق اور شور و شر یا سیاسی پروپگنڈے کے ذریعے ممکن نہیں ہے۔

انسانیت ہر نظام سے بلند ہے

اس کے علاوہ میں ہندوستان کی محبت سلامتی اور امن کو نظر انداز کر کے ادب اور انقلاب کے متعلق نہیں سوچتا، ترقی پسند ایک نظام کے لئے انسانیت کو روندنے میں تکلف نہیں کرنا چاہتے ہیں انسانیت کو ہر نظام سے بلند تصور کرتا ہوں، اگر انسانیت ہی مر گئی تو نظام کو کیا بت بنا کر پوجیں گے!؟

ہم اپنی ضرورت کے مطابق ہر چیز کو اختیار کر سکتے ہیں اور اور اگر ہم اپنے ملک اور اس کے عوام سے محبت کرتے ہیں تو ہمیں معتدل رہنا پڑے گا۔ ترقی پسند مصنفین تو ٹھٹول باز بن گئے ہیں، یقیناً یہ مسخرہ پن انھیں لے ڈوبے گا۔ اور وہ ملک و عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا سکیں گے۔

میں عوام کا ازلی و ابدی خادم ہوں

تجویز کے آخر میں "ترقی پسند مفکرین" کا نتیجۂ فکر ملاحظہ فرمائیے۔ یہ ان کا آخری حربہ ہے، اس حربہ کو انھوں نے جلسہ

لہ پیغامات کی اشاعت سے مراد ہے۔ اس سوال کا جواب نہیں دیا گیا یہ کھلی ہوئی غلط بیانی ہے۔ میں نے جلسہ میں بھی کہا اور مئی کے ایشیا میں بھی جواب دیا۔ جن لوگوں کے پیغامات ایشیا میں شائع ہوئے ہیں میں ان سب کی عزت کرتا ہوں، ان سب نے ملک کی آزادی کے لئے کام کیا ہے لیکن ان کے پیغامات ایشیا کی پالیسی پر اثر انداز نہیں ہوتے" وغیرہ۔ ساغر

میں بھی خوب استعمال کیا اور تجویز کی تان بھی اسی پر ٹوٹتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

"آج جبکہ ہمارے ادب میں دو واضح تصورات ایک دوسرے کی مخالفت کر رہے ہیں ساغر صاحب کا ترقی پسندوں سے دُور ہو جانا کوئی تعجب خیز اَمر نہیں ہے۔ آج ہمارا ملک ایسے دَور سے گذر رہا ہے جب ادیب یا تو عوام کے ساتھ ہو سکتے ہیں یا عوام کے دشمن، آج کوئی تیسرا راستہ نہیں ہے ساغر نے عوام دشمنی کا راستہ اختیار کیا ہے"

ملاحظہ فرمائیے۔ پروپگنڈے کا یہی وہ آرٹ ہے جس سے اپنی نازیت کے لئے زمین ہموار کی جاتی ہے۔ جس کو جو جی چاہا کہہ دیا۔ آج تقسیم کے ردِّ عمل میں مبتلا ہندو عوام اور ہندوستان کے ــــ مایوس و غم زدہ مسلمانوں، غرضکہ تمام ہندوستان کے موجودہ نفسیاتی انتشار اور دبی ہوئی نفرت کے بل بوتے پر لفظوں کے جگنو چمکانے والے، عوام کے خادموں کو عوام کا دشمن کہنے کی جرأت کرتے ہیں، حالانکہ عوام ان کو خوب اچھی طرح پہچانتے ہیں کہ ان کا ہر قدم ہندوستان کے مفاد کے خلاف اُٹھتا رہا ہے۔

میں محنت کش عوام کا نشان ہوں

سب جانتے ہیں کہ میں کسی سیاسی پارٹی کا ممبر نہیں لیکن میں سیاست دانوں سے کہیں زیادہ ایک راسخ سیاسی اعتقاد رکھتا ہوں اور اس اعتقاد پر ۳۵ سال سے اٹل ہوں، اس عقیدہ کو میں دو لفظوں میں بیان کر سکتا ہوں، وطنُ انسانیت، انسانیت و وطن، یہ تصوّرِ وطن کوئی محدود مادی تصور نہیں، اس ملک کے دریا، پہاڑ جنگل اور بستیاں در و بام یا ان کے سنگ و خشت نہیں! یہ تصوّرِ وطن اس انسانیت کو احاطہ کئے ہوئے ہے جو اس ملک میں سانس لیتی ہے۔ یعنی اِس ملک کے عوام!

میں ترقی پسند بورژواژی کے منافق ماحول کی پیداوار نہیں ہوں۔ میں ایک عام غریب گھر میں پیدا ہوا، میں ٹھیٹ عوام کے قلب سے اُچھلی ہوئی ایک آرزو ہوں جسے عوام نے اپنی سچّی محبت میں پرورش کیا ہے۔

میں نے چھیالیس سالہ زندگی اِک عام محنت کش انسان کی طرح گذاری ہے اور اپنے دست و بازو...... کے بل بوتے پر عوام کے لئے کام کیا ہے۔ میں نے اپنی اصول پرستی کو کبھی برباد نہیں ہونے دیا۔ اور آج بھی میری وہی راہ ہے۔

دیسی ریاستوں کی وظیفہ خواری کے باوجود اگر افراد ترقی پسند اور انقلابی کہے جا سکتے ہیں تو غیر وظیفہ خوار سب سے بڑے انقلابی ہیں۔ میں نہ کسی ریاست سے وظیفہ پاتا ہوں نہ کسی پارٹی سے۔ میرے کاموں کی بنیاد میں میرا اپنا خون پسینہ ہے اور ہندوستانی عوام کا سرمایہ، لہٰذا جتنی بے ہودہ باتیں ترقی پسندوں نے اپنے جلسے میں کہی ہیں وہ مجھ سے اپنے قدیم بغض کی بنیاد پر کہی ہیں اور ان تمام باتوں کے متعلق عوام و خواص کو میری زندگی، تاریخ، اور میرے عمل کی روشنی میں فیصلہ کرنا ہے کہ میں ان کا دشمن ہوں یا خادم ــ!؟

(باقی باقی)

ساغر نظامی

محمد آصف

ذہنی غلامی اور ادب

"جب قرطبہ، بغداد اور دہلی کے ایک ہزار سالہ سیاسی عروج اور ثقافتی اقتدار کے بعد مشرقی سلطنتیں زوال آمادہ ہوئیں تو مشرق کے اس زوال سے مغربی اقوام کو مشرق پر یورشیں کرنے کا موقع ملا۔ مشرق کی وہ انسان دوست تہذیب جو دجلہ، فرات، نیل اور گنگا کی وادیوں سے اُبھری تھی۔ اور جس کے آخری علمبردار عرب، مغل اور ترک تھے۔ اس تہذیب کی عظمتیں اور وسعتیں فرنگی تاجروں کی منڈیاں بن گئیں۔ ان کے ساتھ لاطینی عیسائیت کے پادری "خدا محبّت ہے، خدا محبت ہے" کا ورد کرتے ہوئے ایک غلامانہ ماحول پیدا کرتے آئے۔ تجارت اور محبّت کی اوٹ سے فرنگیوں کی قہرمانی فوجیں رپ رپ کرتی داخل ہوئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا مشرق فرنگی کی اس سلطنت کا ایک حِصّہ بن گیا۔ جس پر سورج کبھی غروب نہیں ہوتا۔ لیکن مشرق کا آفتاب غروب ہوگیا! بدنصیب ہندوستان بھی اس طلوع و غروب سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ یہ مشرقی ملک بھی اس اجنبی اقتدار کے سامنے صیدِ زبوں ہو کر رہ گیا۔

پلاسی کی لڑائی سے انڈیا ایکٹ ۱۸۵۸ء تک ایک سو سال کمپنی بہادر کی حکومت، ۱۸۵۸ء سے ۱۹۴۷ء تک تاج برطانیہ کی عنایاتِ خسروانہ! یہ دو سو سال ہماری تہذیب و تمدّن اور ہمارے علوم و فنون کو تباہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اس طویل عرصہ میں تین آدم خور عفریت ہمارا خون چُوستے اور ہمارا گوشت کھاتے رہے۔ نظام جاگیرداری، نوکرشاہی اور فرقہ پرستی نظام جاگیرداری نے ہندوستان کی ۹۵ فی صدی آبادی کو معاشی اعتبار سے غلام بنائے رکھا اور کروڑوں غریبوں کو اپنے امیر ملک کے قدرتی ذرائع سے فائدہ نہ اٹھانے دیا۔ نوکرشاہی نے ہمارے ذہین اور تعلیم یافتہ طبقہ کو انگریز کا زرخرید غلام بنا کر اس کی ذہنی صلاحیتوں کو مسخ کر دیا۔ کتنا بھیجا کھایا ہے اس عفریت نے ہمارا! اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ اس ذہن خور عفریت کے طفیل ہمارے علوم و فنون میں ایک تشنگی پیدا ہو گئی۔ فرقہ پرستی نے تیزاب کی مانند ہمارے عوام کو پھاڑ ڈالا۔ صدیوں کے پڑوسیوں کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا۔ ہمارے اختلافات سے ہمارے حکمرانوں کی گرفت مضبوط ہوتی رہی، انگلستان پر ہُن برستا رہا اور ہماری غلامی کے بندھن مضبوط ہوتے رہے۔ انگریز کی حکومت اور فرقہ پرستی ہماری فطرتِ ثانیہ بن کر رہ گئی۔ انگریز کے عہد میں غلامانہ ذہنیت اور فرقہ پرستی کو خوب فروغ حاصل ہوا۔ کیونکہ انگریز نے اپنے سامراجی اغراض کے لئے انھیں نشو و نما دی۔ یہ وہی غلامانہ ذہنیت اور فرقہ پرستی ہے جو مذہب و ثقافت کی منازل کو طے کرتی ہوئی اب ادب میں ظاہر ہو رہی ہے۔ ترقی پسند ادبی انجمنیں مذہبی انجمنوں اور سماجوں کی جانشین ہیں۔"

"مارکسزم کی جزوی صداقت اور افادیت کا اعتراف کرنا یا اس سے متاثر ہونا بُری بات نہیں لیکن غلامانہ انداز سے اس کی تقلید کرتے ہوئے اپنی صالح روایات کو فراموش کر دینا یقیناً ایسی چیز نہیں جسے کوئی غیور اور زندہ قوم کا ادیب پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھ سکے۔ اس اندھی تقلید سے جو لٹریچر پیدا ہوتا ہے اُسے ادب نہیں کہہ سکتے۔ یہ تبلیغ اور پروپیگنڈا ہے کیونکہ حقیقی ادب جو کسی قوم کی ثقافت اور انفرادیت کا عکّاس اور جمالیاتی اظہار ہے۔ اس کی جڑیں بقول ڈاکٹر عبادت بریلوی روایات کی زمین میں دور تک پھیلی ہوتی ہیں۔ یہی قدامت پرستی اور کلاسکیت ایک ادیب کو جدّت کی راہوں پر چلاتی ہے۔ فن کی کئی منزلوں سے روشناس کرتی ہے اور اس کے باعث اس کے فن کی رگ رگ میں نیا خون موجیں مارنے لگتا ہے اور نئے ولولے انگڑائیاں لیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

غلامانہ فسطائیت

ہمارے ترقی پسند ادیب ذہنی غلام ہیں جو دوسرے ادیبوں کو بھی احتساب، فسطائیت اور مقاطعہ کے کلیسائی حربوں

سے غلام بنانا چاہتے ہیں۔ وہ انجمن سازی اور تنظیم سے دوسروں کو مرعوب کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں محروم اور غلام انسانوں کی مانند ملکیت، اجارہ داری اور اقتدار کی بھوک ہے۔ یہ فسطائیت کا جذبِ غلامانہ ذہنیتوں کی پیداوار ہے۔ ان کے غلامانہ تحکّم میں جبر کے تمام عناصر موجود ہیں۔ یہ دوسرے ادیبوں کو اظہارِ خیال کے جائز اور قدرتی حقوق سے محروم کرنا چاہتے ہیں۔ ہر قوم کا ادب اسکے مزاجِ عقلی اور ثقافت کا عکّاس اور ترجمان ہوتا ہے۔ یہ اس کے اجتماعی ارادہ اور رجحانات کا بے باکانہ اظہار ہے کسی فرد اور کسی ادبی انجمن کو یہ حق نہیں پہونچتا کہ وہ ادبی سواد میں ترقی پسند اور غیر ترقی پسند کے پروانے اور احکامات صادر کرے۔

ادبی جاگیردار

ادب ساری قوم بلکہ ساری انسانیت کی میراث ہے کسی خاص فرد اور ادبی تنظیم کی ملکیت نہیں۔ اس معیار کے پیشِ نظر اُردو زبان کے ہر ادیب کو ترقی پسند ادیبوں پر گرفت کرنے کا حق حاصل ہے کہ اُن سے دریافت کرے کہ کیا ان کی ترقی پسندی نیابت الٰہیہ ہے۔ کیا خدا نے انھیں اس ادبی اقتدار کے حقوق تفویض کئے ہیں؟ کیا ان کی انجمن مملکتِ ادب کا طبقۂ امراء ہے اور انھیں حکومت کے توریثی اور جاگیردارانہ حقوق حاصل ہیں؟ کیا انھیں اُردو زبان کے سب ادیبوں کی رائے عامّہ نے انتخاب کیا ہے اور عارضی طور پر یہ حقوق انھیں دئے گئے ہیں ــــ اور کیا وجہ ہے جب ہم توریثی بادشاہت، جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے خلاف بغاوت کرتے ہیں تو ان ادبی اقتدار پرستوں اور ادبی جاگیرداروں کے خلاف بغاوت نہ کریں۔ یہ ترقی پسند ازلی اور ابدی غلام ہیں۔ جو ادب کے پردہ میں دوسروں کو غلام بنانا چاہتے ہیں ان پر روشن ہونا چاہئے کہ ادب کی دنیا میں نہ کوئی آقا ہے نہ کوئی غلام صرف اساتذہ اور شاگرد ہیں۔ ادب اور فن کا احتساب صرف تاریخ کرتی ہے اور تاریخ کا فیصلہ ہی قطعی ہے۔ آخر شکسپیئر، دانتے، گوئٹے، ملٹن، غالب اور اقبال کو کس نے ادبی عظمت عطا کی۔ کسی کم سواد ادبی انجمن نے یا تاریخ اور انسانیت نے۔ اس کا فیصلہ ایک معمولی سمجھ کا شخص بھی کر سکتا ہے۔ جب ہم احتجاج کرتے ہیں کہ ادب کو حکومت کے قانونی دباؤ اور احتساب سے آزاد ہونا چاہئے اور ہر ادیب کو اظہارِ خیال کی مکمل آزادی ملنی چاہئے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ ذہنی آزادی آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک جائے اور ادب ایک داخلی احتساب کا شکار ہو جائے اور ترقی پسندی کے نام سے اسے زنجیروں میں جکڑ دیا جائے؟"

"میرے نزدیک ترقی پسند مصنفین اپنے طرزِ عمل سے اپنے نصب العین کی مخالفت کر رہے ہیں ــــ میں نے طرزِ عمل کے خلاف آواز اٹھائی ہے نصب العین کے خلاف نہیں۔ میرے خیال میں ادبی حلقوں اور ادبی تحریکات کا معیار بلند ہونا چاہئے، انھیں سازش، گٹھ جوڑ اور دھڑے بندی کے اصولوں پر کام نہیں کرنا چاہئے۔ ان کا اصل مقام انسانیت ہے اور اس بلند مقام سے نزول نہ ادب کی خدمت ہے اور نہ انسانیت کی بلکہ یہ محض ایک سطحیّت ہے۔

ہمیں اپنی ادبی تاریخ کے اس نقطۂ انقلاب پر جائزہ لینا چاہئے کہ ترقی پسندی کے پردہ میں کہیں ہم ذہنی غلامی کے شکار تو نہیں ہو رہے۔ اگر ایسا ہے تو ادبی خلوص کا تقاضا یہی ہے کہ ہم اپنی غلط روش کی اصلاح کریں۔ اور اُردو ادب کو داخلی اور خارجی غلامی سے نجات دلائیں۔ ذہنی غلامی کا نام اگر ترقی پسندی رکھ دیا جائے تو محض نام رکھنے سے ہم ترقی پسند نہیں سمجھے جا سکتے۔ حقیقی ترقی پسندی یہی ہے کہ ہم اپنی ادبی انفرادیت اور ثقافتی روایات کو بھی قائم رکھیں اور بین الاقوامی ادب کے صحت ور عناصر کو بھی ہضم کر کے اپنے ادبی مزاج کا جزو بنائیں۔ اگر ہم نے اس موقع پر یہ صالح ادبی توازن قائم نہ کیا تو اس صورت میں ہم ترقی پسند تو یقیناً نہیں بن سکتے۔ البتہ ذہنی، سیاسی، اور معاشی اعتبار سے غلام ضرور بن جائیں گے۔"

(شاہکار جولائی ۱۹۴۹ء)

غور سے دیکھا تو گمراہوں کا اِک سیلاب تھا
جس ہجومِ حق نگر کو کارواں سمجھا تھا میں

ساغر

انجمن ترقی پسند مصنّفین (بمبئی) کی ادبی جاگیرداری کے خلاف

ترقی پسند ادبی حلقے بھڑک اُٹھے!

فنکاروں اور دانشوروں کے اقتدار شکن خطوط

سلام مچھلی شہری

بھائی جان! جون کا "ایشیا" ملا۔ اس توجہ کا شکر گذار ہوں "ایشیا" کے بارے میں پورے ہندوستان اور پاکستان کے اہل قلم اپنی رائے دے چکے ہیں۔ میں پڑھتا رہا ہوں۔ خوش ہوتا رہا ہوں — کہ ایشیا آیا، ایشیا دیکھا گیا، پرکھا گیا، اور ایشیا تمام ادبی حلقوں پر چھا گیا! مجھے الگ سے کوئی رائے نہیں دینی ہے، صرف یہی آرزو ہے کہ میں اسے روز بروز پھلتا پھولتا دیکھوں اور خدا اسے اس لعنت سے دور رکھے جس کا شکار ملک کے بیشتر بلند پایہ جرائد ہو چکے ہیں اور ہو رہے ہیں۔ اور اس لعنت کی ابتدا ادبی بد دیانتی اور Fraud ہی سے ہوتی ہے۔

دوسری بات۔

۱۹۳۵ء سے اب تک مجھے معلوم ہے، اور یقیناً آپ بھی جانتے ہیں کہ میں نے کس قسم کی شاعری کا پرچار کیا، میرا سیاسی نظریہ کیا رہا ہے، میں نے اپنے آدرش کے لئے کتنی قربانیاں کی ہیں۔ اور آپ یہ بھی جانتے ہیں کہ جعفری ہوں یا سبط حسن، علیم صاحب ہو یا بنّے بھائی آپ ہوں یا فرید بھائی سب کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جب بھی اتنی مدت میں، ترقی پسندی نعرہ بازی ہو گئی ہے، میں اپنے دوستوں کے ساتھ نہیں رہ سکا ہوں۔ ادب سے زندگی کا تعلق بے شک ہے مگر زندگی محض سیاست ہی تو نہیں ہے۔ بلا شبہ دنیا کا اقتصادی حل، میرے خیال میں صحیح کمیونزم میں مل سکتا ہے مگر آرٹ، اگر در اصل یہ زندگی کے تجزیہ کا نام ہے۔ اتنی محدود چیز تو نہیں کہ وہ صرف پارٹی مینوفسٹو ہو کے رہ جائے۔ تو یہی وہ Point ہے جہاں میں اپنے دوستوں، اپنے بچپن کے ساتھیوں سے اختلاف رکھتا ہوں۔ اور خدا گواہ ہے، مجھے معلوم ہے خود میرے نمایاں ترین ترقی پسند احباب کے دل میں بھی یہی بات ہے۔ وہ بھی چپکے چپکے اپنی سچی خوشی اور غم کے لئے ایسا ہی آرٹ Produce کرتے ہیں جو میں چاہتا ہوں۔ شکایت یہ ہے کہ وہ اسے چھپاتے ہیں اور نئے لکھنے والوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔

باقر رضوی

ساغر صاحب آداب عرض!

جون کا ایشیا ملا۔ شکریہ۔ سب سے پہلے تو میں ایک تصحیح چاہتا ہوں، صفحہ ۹ پر (باقر رضوی۔ ردولی۔ بارہ بنکی) کا جو خط شائع ہوا ہے وہ میرا نہیں بلکہ میرے حقیقی بھانجے باقر مہدی کا ہے۔ باقر مہدی نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے مجھے اس سے بہت کچھ اتفاق ہے۔ میرے خیال میں ہر ادب دوست انسان جو اعلیٰ اقدار کی ابدیت کا قائل ہو، ایک بہتر نظامِ حسیات کا تصور رکھتا ہو اور انسانیت دوست اور جمہوریت پسند عناصر کا ہم نوا ہو انجمن ترقی پسند مصنفین کا رکن ہو سکتا ہے۔ حال ہی میں ہندوستان میں کمیونسٹ ادیبوں نے ترقی پسندی کو اپنی اجارہ داری بنانے کا جو ارادہ ظاہر کیا ہے وہ لائق مذمت ہے، ادب کیا زندگی کے کسی شعبے میں "ذات بندی" "کٹھ ملائیت" اور "برہمنیت" کو پسند کیا گوارا تک نہیں کیا جا سکتا، یہ فراخ دلی، وسیع الخیالی

اور ادبی دیانت داری کے خلاف ہے۔

پھر ترقی پسندوں نے ایک محدود حلقہ بنا کر "من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو" کا جو سلسلہ "نئے ادب کے معمار" کے نام سے جاری کیا ہے وہ بھی مناسب نہیں۔ اس طرح یہ اپنے نظریہ کو خود نقصان پہونچا رہے ہیں۔ اور معقولیت پسند ادیبوں کو اپنا مخالف بنا رہے ہیں۔

میں بہت سے ایسے مشہور ترقی پسند ادیبوں سے واقفیت رکھتا ہوں جو صرف تحریر و تقریر اور شاعری کی حد تک ترقی پسند ہیں اور عملاً انتہائی رجعت پسندی کا ثبوت دیتے ہیں۔ ان کے معمولات اور آپس کے تعلقات کی بنیاد محبت، ہمدردی، انصاف پسندی حق بینی اور باہمی منساہت کے بجائے نفرت، خود غرضی، انانیت جنبہ داری اور غیبت پر ہے۔ ان کے قول و فعل کا یہ تضاد بہت افسوسناک ہے۔ مگر یہ لوگ اپنی ان کوتاہیوں اور کمزوریوں کی جو عالمانہ توجیہیں کرتے اور ان کا جو فلسفیانہ جواز ڈھونڈتے ہیں وہ بھی کچھ کم مضحکہ خیز اور قابل مذمت نہیں۔"

منظر صدیقی اکبرآبادی

"ترقی پسند مصنّفین کے متعلق آپ نے جو قدم اٹھایا ہے وہ آپ کی جرأت اور دلیری کا آئینہ دار ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے جو مشورے دئے ہیں وہ معقول و مناسب ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے کام کی چیز ہیں۔

میں بھی اسی سلسلے میں ہفتہ وار ایشیا میں ایک سلسلہ شروع کر رہا ہوں، آپ اسے ضرور پسند فرمائیں گے۔"

حضرت ادیب مالیگانوی (ناسک)

ایشیا کا جون نمبر ملا، یہ اشاعت اپنے بعض خاص مضامین نظم و نثر کے اعتبار سے بہت اہمیت رکھتی ہے، ترقی پسندی اور ترقی پسندوں پر اس سے قبل بھی نہایت زوردار بحثیں ہو چکی ہیں لیکن ایشیا کے مباحث سے پتہ چلتا ہے کہ یہ آخری اور فیصلہ کن بحث ہوگی۔

برائی خواہ خیالات کی ہو، خواہ اعمال کی، کوئی بھی بھلا آدمی نہ اس کو پسند کرتا ہے نہ اس کی حمایت لیکن اس کا یہ مقصد کبھی نہیں تھا کہ اپنے گھر کے علاوہ باہر کسی جگہ نیکی کا نشان ہی نہیں ہے

ابھی کل رات دوستوں میں ایشیا ہی کا تذکرہ تھا اور اس کی پالیسی پر بات چیت جس کے ماتحت عبّاس جیسے استوار ترقی پسند اور رامانند ساگر جیسے ادیب معتوب ہو رہے ہیں۔

نوجوان شعراء کی ایک پوری نسل عجیب کشمکش میں ہے، میں سمجھتا ہوں۔ ایشیا کی بحث و تنقید پڑھنے سے اکثر نوجوانوں کا بھلا ہوگا۔

مخلص۔ ادیب مالیگانوی

قمر زاہدی (گیا۔ بہار)

ماہنامہ ایشیا مجھے بہت پسند ہے۔ اتنا ہی جتنا کہ مجھے آپ سے انس پیدا ہو گیا ہے ایشیا سے بھی اسی قدر انس پیدا ہو گیا ہے خصوصاً سب سے زیادہ مجھے آپ کے ایڈیٹوریل اور نظمیں بہت پسند آتی ہیں۔ گذشتہ ماہ آپ نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ واقعی آپ کی بہت بڑی اخلاقی جرأت ہے۔ میں کئی ماہ سے انجمن ترقی پسند مصنّفین کے اس رویّہ کو محسوس کر رہا تھا اور دل ہی دل میں کڑھ رہا تھا۔ خصوصاً جب عصمت چغتائی صاحبہ نے بھوپال کانفرنس میں یہ کہا کہ میرے ہاتھ میں اس وقت دو کتابیں ہیں ایک ایم اسلم کی "رقص ابلیس" دوسری رامانند ساگر کی کتاب "اور انسان مر گیا" اور جب میں ان دونوں کتابوں کا مطالعہ کر چکی تو میں نے فیصلہ کیا کہ رامانند ساگر، ایم اسلم سے بھی زیادہ رجعت پسند ہے، اسی طرح بیچارے خواجہ احمد عباس کو بھی رجعت پسند کا خطاب دیا گیا۔ میرے خیال میں وہ صرف اس لئے کہ انھوں نے رامانند ساگر کی کتاب "اور انسان مر گیا" کا دیباچہ تحریر کیا ہے۔ کیا خواجہ احمد عباس جو ترقی پسند اور رجعت پسند ہونے سے زیادہ انسانیت پسند شخص ہے اس کا یہ جرم ہے کہ اس نے کیوں رامانند ساگر کی کتاب کا دیباچہ تحریر کیا یا صرف یہ بات ہے کہ انجمن .... صرف حکم لگانا جانتی ہے اور جب چاہے جسکو ترقی پسند کہہ کر اچھال دے اور جب چاہے رجعت پسند کا خطاب دیدے۔

اگر واقعی ایسی بات ہے تو یہ ترقی پسندی بجائے خود ایک بدترین رجعت پسندی ہے۔ سب سے بڑی مصیبت تو یہ ہے کہ یہ ترقی پسند خود کو جتنا ترقی پسند سمجھتے ہیں دوسروں کو اسی قدر رجعت پسند سمجھنے لگتے ہیں۔"

(باقی باقی)

SURAIYA IN "DILLAGI"

NARGIS IN KAPOOR'S "BARSAAT"

ڈاکٹر سیّد محمود (وزیر مواصلات بہار)   مترجمہ:- امیر محمد خاں (جامعی)

برطانوی دور میں فرقہ وارانہ کلچر کی تخلیق

آیئے ہم اپنی بیتی ہوئی تاریخ پر نظر ڈالیں اور اُن بداعتمادیوں اور کدورتوں کے بنیادی اسباب کا جائزہ لیں جن سے ہمارا وہ کلچرل اتحاد ملیامیٹ ہوگیا جو ہندوستان کو وسطی دور میں حاصل تھا۔ چونکہ جداگانہ کلچر کی رغبتوں کا یہ عمل سو سال سے جاری تھا اس لئے اس کے اثرات لے ظاہر ہے گہری جڑیں پکڑ لی تھیں اور طبیعتوں میں مَیل پڑ گیا تھا

سیاسی واقعات کے زیرِ نظر مضمون سے ایک گہری بات ضرور واضح ہوجاتی ہے اور وہ یہ کہ مفاد رکھنے والی پارٹیوں کا دو بڑی جماعتوں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑا دینا ہمیشہ ممکن رہا۔ ۱۹۲۳ء سے مسلم جماعت شدید سے شدید فرقہ وارانہ لیڈروں کی رہنمائی قبول کرتی گئی۔ اس سیاسی منظر کا آخر کیا جواب ہے؟

یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ فرقہ واریت کی بنیاد خوف اور شک پر ہے۔ جن لوگوں نے اپنی جماعتوں کی لیڈرشپ حاصل کرنا چاہی انھوں نے زیادہ تر ان دو جذبوں پر اپنا سارا کھیل کھیلا ہے۔ ذیل میں نمونہ کے طور پر چند اقتباس ملاحظہ ہوں۔

ایک سربرآوردہ مسلم لیڈر فرماتے ہیں "موجودہ منزل میں ایک غیر تربیت یافتہ غیر منظم اور بے سروسامان اقلیت کو ایک ایسی اکثریت کے ساتھ جو بے انتہا منظم اور تعداد میں بہت برتر ہو ملا دینے کی کوشش کے معنی یہ ہوں گے وہ اقلیت ختم یا غرق ہوجائے، جو شخص بھی مسلمانوں کے معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی حالات سے واقف ہے وہ بغیر خطرناک شکوک کے ایسی نازک صورت کے پیدا ہوجانے کا خیال تک نہیں کرسکتا ہے۔

ادھر سر گوکل چند نارنگ فرماتے ہیں "وہ (ہندو) بھی سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو باقی آبادی کے ہم پلّہ کرنے کے معنی مکمل مسلم غلبہ کے ہوں گے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ مسلم متحد ہیں یا کم از کم غیر مسلموں کے خلاف اپنی حفاظت اور جماعت کی فلاح کی خاطر اُن میں متحد ہوجانے کی صلاحیت موجود ہے اور ادھر باقی ہندو آبادی کا حشر یہ ہوگا کہ وہ مختلف فرقوں میں بٹ جائے گی اور مسلمانوں کے جارحانہ عمل کے خلاف متحدہ محاذ قائم نہیں کرسکے گی"۔

دونوں جماعتوں کے ممتاز لیڈروں کے بیانوں سے یہ جو دو اقتباس پیش کئے گئے۔ اُن سے اندیشوں اور کدورتوں کی بو آتی ہے۔ انیسویں صدی میں جو من مٹاؤ پیدا کیا گیا اور دل پھاڑے گئے اس کا یہ انجام ہے۔ مسلم علماء نے جو رویّہ ہندو حکومت کی جانب قائم رکھا اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اٹھارویں صدی کے آخر تک جماعتوں کے دلوں کو اس قسم کے اندیشوں نے نہیں ستایا تھا۔ مسٹر ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر نے اپنی کتاب "ہندی مسلمان" میں جونپور کے قاضی کا فتویٰ درج کیا ہے۔

"دو الگ الگ مذہبوں کے رہتے ہوئے بھی ان میں کسی قسم کے گہرے کلچرل اختلاف دکھائی نہیں دیتے۔ ہندو اور مسلمان دونوں ہندی اور اُردو کی ترقی میں برابر کے شریک رہے اور انھیں ایک دوسرے کے مذہب اور علم کے مطالعہ میں مسرت ہوتی تھی۔ اُن سب کے فن ایک ہوتے تھے اور اور یاتراؤں، عرسوں اور تہواروں میں شریک ہونے نہ ہونے کا اُن میں کوئی تعصّب نہیں ہوتا تھا۔ جہاں کے بھی ہوں سب ایک زبان بولتے تھے۔ ایک ہی قسم کا لباس پہنتے تھے۔ ایک ہی طرز پر اپنے مکان سجاتے تھے اور سب کا کم از کم اس دنیا کی زندگی کے متعلق ایک ہی نظریہ تھا۔ اُن کی صنعت اور تجارت شہر کے اور گاؤں کے دھندے روزگار ایک ہی معاشی نظام کے

17

تار و پود تھے"۔

بدقسمتی سے ایک تیسرے فریق کے نمودار ہونے سے کلچرل اتحاد کا یہ رشتہ ٹوٹ گیا اور سیاسی مقاصد کی خاطر پیدا کئے گئے رجحانات نے دونوں جماعتوں کو دو علیحدہ گروہوں تنظیم اور سنگٹھن کا موقع دیا۔ مغربی تعلیم کے رواج پانے اور انگریزی پڑھنے پر زور دینے کا انجام یہ ہوا کہ ہم ایک دوسرے کی زبان، ادب، علم اور فلسفہ کے مطالعہ میں غفلت برتتے گئے اور ہندو نوجوانوں کو یورپی علوم و فنون کی تعلیم کے لئے ذرا سی ہندی یا سنسکرت کے رنگ کے ساتھ پالا پوسا گیا تو ادھر مسلمانوں کو اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم کے لئے پرورش کیا گیا۔ جو ہندو اور مسلمان، ہندو مسلم دونوں زبانیں پڑھا کرتے تھے اُن کی تعداد گھٹتی چلی گئی، آپس کی مروّت محبّت میں فرق آگیا اور دل پھٹتے چلے گئے۔

مسلمانوں کی حکومت کے دور میں وسطی زمانے کو لیجئے رواداری اور محبّت کا یہ عالم تھا کہ ہندو مصلح اور مسلم مصلح دونوں نے ایسی مذہبی اور اخلاقی تحریکیں شروع کیں جن کا تعلق دونوں جماعتوں سے ہوتا تھا۔ لیکن ۱۹ ویں صدی کے مصلح اس سے مستثنیٰ رہے۔ اوّل الذکر گروہ کی تعلیم و تبلیغ میں عالمگیر تخاطب اور عالمگیر دعوت ہوتی تھی اور دوسرا گروہ تنگ نظر و فرقہ پرست تھا۔ مثال کے طور پر کبیر نانک، چیتنیا، دادو، رجب بابا فرید، شیخ نورالدّین، نظام الدین اولیا وغیرہ کا موازنہ دورِ جدید کے ہندو اور مسلم تہذیبوں کو زندہ کرنے کا دعویٰ کرنے والے لیڈروں سے کیجئے۔ وسطی زمانے کے مذہبی رہنما چیزوں کی اصل ماہیت اور مذہب کے حقیقی مطالب و معنی کا خاص خیال رکھتے اور فروعات عقائد اور روایات کو بُرا کہتے تھے۔ اس کے برعکس دورِ جدید کے مصلح مذہب کے گہرے جذباتی اور روحانی مفہوم کے بجائے خاص طور سے اسکے ظاہری اور شرعی احکام میں الجھ کر رہ گئے۔ اگلوں نے مقدّس کتابوں کی نازل شدہ آیتوں اور شلوکوں کو غیر ضروری احترام اور تعزیری خوف کے جذبہ سے نہیں دیکھا کیونکہ ان کے ذہن وسیع اور آزاد تھے اور اُن کی روح خطر پسند تھی لیکن موخرالذکر نے اُن آیتوں اور شلوکوں کا ایک تنگ حصار اپنے اردگرد کھینچ لیا اور اس کے لفظی معنی، متن اور تفسیر یا تاویل میں اُلجھ کر رہ گئے۔ چنانچہ ایک کی دوسرے سے غیریت اور بیگانگی کا ردّعمل دونوں پر ہونا ناگزیر تھا۔

جداگانہ فرقہ واریت کا شعور کیوں پیدا ہوا اور پروان چڑھا، اس کی ذمہ دار تین چیزیں تھیں۔

پہلے تو یہ کہ ہندوستان کے کلچرل اتحاد کی بنیاد اس نیم سماجی اور نیم سیاسی استحکام پر قائم تھی جسے مغلیہ حکومت نے حاصل کیا تھا۔ اس کا شیرازہ بکھرنے سے اتحاد کی ایک زبردست قوّت فنا ہوگئی۔ دوسرے یہ کہ انگریزوں نے محکوم رعایا کے ساتھ جس طرح بیوہار اور معاملات رکھے اُن سے دونوں کے اختلافات زیادہ نمایاں ہوئے۔ فاتح قوم ایک زمانہ تک مسلمانوں سے حقارت اور ہندوؤں سے نفرت کرتی رہی۔ انھوں نے ایک کو کچلنا اور دوسرے کی سرپرستی کرنے کی کوشش کی اور اس طرزِ عمل کا دونوں جماعتوں پر ایک دوسرے کے خلاف ردّعمل ہوا۔ تیسرے یہ کہ عیسائی پادریوں اور ان کے ہمدرد برطانوی عہدیداروں نے اس بات کی کوشش کی کہ ہندو عیسائیت قبول کرلیں اور اپنے نئے حاکموں کے وفادار حامی بن جائیں۔ ولبرفورس، چارلس گرانٹ، مارشمن، ڈف اور دوسروں کی تحریروں اور تقریروں سے اس بیان کی بہت اچھی طرح تصدیق ہوجاتی ہے۔ ۱۸۳۶ء میں میکالے نے اپنے باپ کو جو خط لکھا تھا اُس میں وہ لکھتا ہے "ہندوؤں پر اس تعلیم کا اثر بڑا غضب کا ہوا ہے۔ جس ہندو نے بھی انگریزی تعلیم حاصل کی ہے بس اسے پھر اپنے مذہب سے کوئی لگاؤ نہیں رہا ہے۔ بعض ہندو مصلحت کی خاطر اپنے دھرم کو مان رہے ہیں لیکن بہتیرے خود کو خالص (deists) کہتے ہیں اور بعض عیسائیت قبول کرلیتے ہیں۔ یہ میرا پختہ یقین ہے کہ اگر تعلیم کے ہمارے منصوبوں پر پورا پورا عمل ہوا تو آج سے تیس برس بعد بنگال کے معزز طبقوں میں ایک بھی بُت پرست باقی نہیں رہے گا۔"

سر چارلس ٹریویلین نے جو میکالے کا بہنوئی تھا ایک پارلیمنٹری کمیٹی کو ایک تحریر پیش کی تھی۔ اُس میں وہ ہندوستان کے مختلف حصّوں سے متعلق اپنے مشاہدے اور تجربے بیان کرتے ہوئے اس تضاد کو بتاتا ہے جو بنگال اور اُن خطوں میں پایا جاتا ہے جہاں انگریزی تعلیم کے اثرات نہیں پہونچے ہیں پہلے تو "اونچ نیچ" امیر اور غریب سب کو ایک ہی دھن تھی کہ اپنی سیاسی حالت کو بہتر بنائیں۔ اوپر کے طبقے اس امید پر

زندہ تھے کہ انھیں اگلی شان حاصل ہوگی اور نیچے کے طبقے
والے یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ دیسی حکومت قائم ہو جانے پر
دولت اور عزت حاصل کرنے کی راہ پھر سے پیدا ہو جائے گی"
"بنگال میں" یا تو یہ کہ وہ انگریزوں کے گلے کاٹنے کی سوچتے تھے
اب انھیں اس بات کی آرزو رہنے لگی ہے کہ وہ انگریزوں کے
ساتھ گرانڈ جوری میں بیٹھیں یا مجسٹریٹوں کی بینچوں پر بیٹھیں"

اسی تحریر میں وہ ہندوؤں میں انگریزی تعلیم کے پھیلانے
کے فوائد ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔

"انگریزی ادب کا اثر اس کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا
کہ انگریزوں سے تعلق قائم رکھنے کے حق میں ہو۔ جب ہندوستانی
نوجوان ہمارے ادب کے ذریعے ہم سے واقف ہوتے ہیں تو
وہ ہمیں غیر ملکی سمجھنا تقریباً ترک کر دیتے ہیں۔ وہ ہماری
قوم کی بڑی ہستیوں کے متعلق اسی دلچسپی اور گرمجوشی کے
ساتھ تذکرہ کرتے ہیں جیسا کہ ہم کرتے ہیں۔ ایک ہی قسم کی
تعلیم ایک ہی قسم کی چیزوں میں دلچسپی اور ہمارے ساتھ ایک
ہی قسم کے پیشوں میں رہنے سے ہندو رہنے کے بجائے ان میں
انگریزیت زیادہ آجاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح کہ رومن پروشیلز
میں گال اور اطالوی ہونے کے بہ نسبت رومنیت زیادہ آگئی۔
غرض کہ انگریزوں کو سمندر میں ڈھکیلنے کا خیال تو کجا انھیں
اپنی بہتری کا بھی ہوش نہیں ہے۔ بلکہ بہتری کا تصور ان کے
نزدیک وہ ہے جو انگریزوں سے ان کا تعلق استوار کرے اور
انھیں انگریزی حفاظت اور ہدایت کا غلام بنائے"

انگریزوں نے اور دوسری جتنی کلچرل سرگرمیوں کا سرکاری
یا غیر سرکاری طور پر بیڑا اٹھایا ان سب کا یہی مقصد تھا۔
سر ولیم جونز، ہوریس ہیمن ولسن، پرنسیپ اور دوسرے
مستشرقین نے ایشیاٹک سوسائٹی قائم کی اور قدیم زبانوں
میں تحقیقات کیں۔ انھوں نے حساس طبیعت ہندو نوجوانوں
کے ذہن کے سامنے پراچین ہندو سوسائٹی کی ایسی عجیب و غریب
تصویر پیش کی جو اس زمانہ کی دکھ بھری فلاکت زدہ پست اور
ذلیل زندگی کے مقابلے میں نوع انسان کے سنہرے دور کی
دکھائی دیں۔ مورخ سر ہنری الیٹ اور دوسرے مستشرقین
نے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان کی تاریخ میں ہندو دور کے بعد
جو زمانہ آیا وہ نہایت ہی شدید قسم کے مذہبی کٹرپن اور ظلم کا
زمانہ تھا۔ اور منعم انگریزوں کی مداخلت سے ہندوؤں کو نجات
ملی۔ ہندوؤں کی بقا اور ترقی کے جو کالج قائم کئے گئے تھے
ان میں جب ہندو نوجوانوں نے یہ سبق سیکھے تو ان میں
مسلمانوں کے خلاف ایک مقدس خوف و نفرت کا جذبہ پیدا
ہوا اور وہ برطانوی اقتدار کو خدا کی مشیت تصور کرنے لگے
یہ اگرچہ صحیح ہے کہ ہندوستان پر انگریزوں کی تاریخ زبان
اور ادب کا بہت بڑا احسان ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ
تقریباً ایک صدی تک ہندوستان کی تاریخ جس طرح سے
اسکولوں اور کالجوں میں پڑھائی گئی اس کے ہندو اور مسلم
نوجوانوں پر مختلف اثرات مرتب ہوئے۔

اس تعلیم سے ہندو نوجوانوں کے دماغوں میں انتقام
کا جذبہ پیدا ہوا اور مسلم نوجوانوں میں بے جا غرور شیخی اور
اکڑ کا احساس پیدا ہوا۔ ان دونوں جذبوں کا ایک دوسرے
پر عمل اور ردّ عمل جاری رہا۔ کئی نسلوں نے اس فضا میں
جنم لیا اور پرورش پائی نتیجہ سے ظاہر ہے کوئی تعجب نہیں
ہونا چاہیے۔

کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج میں ہندستانی زبانوں کو
خاص طور پر ابھارا گیا۔ اس لئے کہ انگلستان سے جو ناتجربہ
کار نوجوان اس ملک کے نظم و نسق کے لئے نئے نئے آتے تھے
انھیں ہندستانی زبانیں اس کالج میں سیکھنی پڑتی تھیں۔
کالج کے ارباب انتظام نے چاہا کہ ان افسروں کے فائدہ کے
لئے کتابیں ان زبانوں میں لکھی جائیں۔ اس وقت عدالت
کی زبان فارسی تھی۔ لیکن اس کا دائرہ بہت محدود تھا
شمالی ہند میں صرف اردو ہی ایسی زبان تھی جسے سب جانتے
تھے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں شائستہ لب و لہجہ کی معیاری
زبان کا چلن تھا۔ اس میں نثر اور نظم دونوں لکھی جاتی تھیں
اور برج بھاشا میں صرف نظم کہی جاتی تھی۔ کالج کے پرنسپل
گلکرائسٹ نے انیسویں صدی کے اوائل میں درسی کتابوں
کی تالیف کے لئے اردو کے عالموں کو طلب کیا اور انھوں نے
پرنسپل کی ہدایت اور خواہش پر عمل کیا اس طرح نظم کی
کئی کتابیں اردو میں تالیف ہوئیں۔

بعد میں ان کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اس پر اکتفا
نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ مسٹر ایف۔ ای۔ کی (F.E. KEAY)

کے الفاظ ملاحظہ ہوں "اردو لغت بیشتر فارسی اور عربی زبانوں کی رہین ہے اور یہ زبانیں خاص طور سے محمّدیت —— (Mohammadanism) —— سے تعلق رکھتی ہیں (یہ صحیح نہیں ہے) اس لئے ایک ایسی ادبی زبان بہت ضروری سمجھی گئی جو زیادہ تر ہندؤں کو بھائے اور یہ چیز اس طرح حاصل کی گئی کہ اُردو کو لیا گیا مگر اس سے فارسی اور عربی نژاد الفاظ خارج کر کے سنسکرت کے الفاظ داخل کئے گئے

غرض ایک ایسی نئی ادبی زبان وجود میں لائی گئی جسے ۱۸۰۰ء تک نہ تو نثر میں استعمال کیا گیا اور نہ نظم میں یہانتک کہ ہندوؤں نے بھی اسے کبھی استعمال نہیں کیا۔ اس طرح اُردو اور ہندی تنازع کے بیج بوئے گئے۔ عیسائی مبلّغوں نے لسانی اختلافات کو ہوا دی۔ ہندوستانی زبانوں کا سب سے بڑا مستند ماہر سر اے جی گریرسن کا بیان ہے کہ "بدقسمتی سے سب سے طاقتور انگریزی اثر اس دور میں سنسکرت کے حامیوں کی حمایت میں استعمال ہوا ہے۔ سنسکرت زدہ ہندی کو بیشتر پادریوں نے استعمال کیا اور بائبل کا ترجمہ بھی اس زبان میں کیا گیا۔ جن چند ہندوستانی لیکھکوں نے شدھ ہندی کے استعمال کی حمایت کی انھیں اس طاقتور گمراہ کن کوشش کے مقابلہ میں کم کامیابی ہوئی تھی۔"

اُس ہندی کو جس کی ابتدا اس طرح کی گئی جب ۱۸۵۷ء تک زیادہ کامیابی نہیں ہوئی تو انگریزوں کی مسلم دشمنی نے انتہائی بھیانک روپ اختیار کر لئے۔ ۱۸۳۷ء میں فارسی کی اگرچہ عدالتی زبان کی حیثیت ختم کر دی گئی۔ لیکن اردو اس وقت بھی ہندوستان کی قومی زبان خیال کی جاتی تھی۔ دہلی کالج مرحوم نے جس کا قیام اردو زبان میں مغربی تعلیم پھیلانے کی غرض سے ۱۸۲۹ء میں عمل میں آیا تھا۔ سائنس اور فلسفہ کی انگریزی کتابوں کے اردو ترجموں سے بڑی خدمت انجام دی لیکن ۱۸۵۷ء کے پُر آشوب زمانے میں یہ کالج بھی بند کر دیا گیا۔

اب، ہوا یہ کہ بہت سے انگریز حکّام نے ہندی کی حمایت کا بیڑا اُٹھایا کیونکہ اس وقت تک اُس میں تھوڑی ترقی ہو پائی تھی۔ چنانچہ اخباروں میں اس کی حمایت میں مضامین لکھے گئے ہندی زبان کے قواعد بنائے گئے۔ مدرسوں کے لئے درسی کتابیں لکھی گئیں اور اس قسم کے مطالبات پیش کئے گئے کہ ہندی کو عدالتی زبان تسلیم کیا جائے۔ ہندو اس دامِ فریب میں آ گئے حالانکہ بھارتیندو ہریش چندر جیسے ممتاز اور نامور مصنّف نے بعد کو ۱۸۷۱ء میں یہ بات تسلیم کی کہ اگروال مردوں اور عورتوں کی زبان کھڑی بولی یا اُردو ہے لیکن اُدھر تو ہندی کی حمایت میں پروپگنڈے کا بلا کا طوفان برپا کر دیا گیا تھا۔ بنگال بہار اور اڑیسہ کے نائب گورنر سر جارج کیمبل نے ۱۸۷۲ء میں اپنے اس مصمّم ارادہ کا اعلان کیا کہ بہار کی عدالتوں میں اُردو کا چلن اور وہاں کے مدرسوں میں اس کی تعلیم ختم کر دی جائے، دس سال بعد ۱۸۸۲ء میں ہندوؤں نے تعلیمی کمیشن کے سامنے ہندی کا معاملہ پیش کیا اور اسکی حمایت میں زور دیا لیکن صدر کمیشن ڈاکٹر ہنٹر نے اُن کی درخواست پر کوئی توجہ نہیں کی لیکن ۱۹۰۰ء میں صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کی حکومت نے ہندوؤں کا یہ دعویٰ بھی تسلیم کر لیا اور ساتھ ہی ساتھ عدالتوں میں ہندی زبان اور رسم الخط کے استعمال کی منظوری بھی دیدی۔ جن نتائج کی توقع تھی اور جن کے لئے خفیہ طور پر کام کئے گئے تھے وہ برآمد ہو کے رہے اور وہ یہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان خلیج وسیع ہو گئی۔

ذرا غور کیجئے ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد سے جو نتیجہ حاصل ہوا تھا وہ تو یہ تھا کہ ہندو مسلم کلچر ایک دوسرے میں جذب ہوئے اور جب انگریز یہاں برسرِ اقتدار آئے تو اُن کی حکومت نے بغض و عناد اور نفاق و انتشار پیدا کرنے کی سازش کی۔

۱۹۰۰ء سے جدید ہندی نے ترقی کی لمبی لمبی ڈگیں بھریں اور اچھا خاصہ ادب پیدا بھی کیا لیکن اس ساری ترقی کی ہمرکاب بڑھتی ہوئی مسلم دشمنی ہے۔ وسطی دور کی ہندی نے مغلوں کے زمانے میں جو ترقی کی تھی اس کا مقابلہ اگر موجودہ ہندی کی ترقی سے کیا جائے تو کتنا تضاد نظر آتا ہے وہ ترقی کہیں زیادہ شاندار تھی ایسی کہ اس سے مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ اُس ترقی میں مسلمانوں کا تعاون بہ رضا و رغبت شامل تھا اور انھوں نے گرمجوشی کے ساتھ اس کی حمایت کی اور بیش بہا خدمات انجام دیں۔ اِس سے ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ جس ترقی کی بنیاد محبت اور اشترک پر خود بخود ہوئی ہو اُس

میں اور اس مصنوعی ترقی میں کتنا فرق ہے جو اس لئے اُبھاری اور لادی گئی ہو کہ اس کا انجام دشمنی ہو

کیا یہ خون کے آنسو رولنے کی بات نہیں ہے کہ ہندوستان میں مسلم فرمانروائی ایک طویل زمانہ تک قائم رہی ہے اور کبھی اُس پورے دَور میں یہ نہیں ہوتا ہے کہ زبان کے مسئلہ پر کوئی جھگڑا اٹھا ہو۔ یہانتک کہ اورنگ زیب عالمگیر بھی جنھیں کٹر مذہبی قسم کا فرمانروا خیال کیا جاتا ہے۔ زبان کے معاملہ میں تعصبات سے پاک تھے اُن کے کسی رقعہ میں یہ ذکر آیا ہے کہ دو قسم کے آم انکے خاصہ میں پیش کئے گئے اور ان سے درخواست کی گئی کہ آموں کی ان قسموں کے نام تجویز فرمائے جائیں تو انھوں نے اُن کے ہندی نام "رسنا ولاس" (لذت زبان) اور "سدھا رس" (امرت کا عرق) پسند کئے۔ اس کے برعکس آج صورت یہ ہے کہ یہی مسئلہ دونوں جماعتوں کے درمیان نفاق اور پھوٹ کا سبب بنا ہوا ہے۔

مسلمانوں کا ہندی کے متعلق جو موجودہ رویہ ہے اس کی وضاحت میں وہ یہ کہتے ہیں کہ انھیں ہندی زبان سے کوئی کد نہیں ہے۔ اس لئے کہ ماضی میں اُن کی ہندی سے وابستگی اس ......چیز کو صاف بتا رہی ہے لیکن آجکل...... جس چیز کے وہ مخالف ہیں وہ قوم دشمنی کا جذبہ ہے جو ہندی کی تحریک میں درپردہ کام کر رہا ہے۔

مملکت ہند (سیاسی وحدتِ ہند) کے خاتمے، دوسرے انگریز حاکموں کی ہندوستانی جماعتوں کو ایک دوسرے کے خلاف متوازن رکھنے کی پالیسی اور تیسرے جدا جدا کلچرل تحریکوں کی زبردست حمایت، ان تین وجوہ کی بنا پر ہم اوپر بحث کر آئے ہیں مگر ان کے علاوہ ایک وجہ اور بھی ہے جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کی بنیادیں ہل گئیں، ایک طرف تو علیحدگی و کنارہ کشی کی اور دوسری طرف پراچین سبھیتا کو زندہ کرنے کی تحریکیں پرورش پاتی رہیں۔ اس کے باوجود کہ پرانی تہذیب کو زندہ کرنے کی تحریک ایک دامِ فریب ہوتی ہے۔ جماعتیں اپنی اپنی تاریخ کے کسی خاص دَور میں اس میں پھنس جاتی ہیں چنانچہ ہندو اور مسلمان دونوں اس سہانے جذبے کے شکار ہوئے اور اس ایقان میں غلطاں رہے کہ وہ وقت کے دھارے کو اُلٹا بہا دیں گے اور جو زمانہ گذر چکا ہے اس کی روح اس کے رسم و رواج اور اداروں کی تسخیر کر لیں گے، تہذیب یا سبھیتا کو زندہ کرنے کے جذبے اور تحریک کے شکار ہونے والوں میں سب سے پہلے ہندو تھے۔ ایک طرف تو مغرب کی تسخیری یلغار نے انھیں اپنی اخلاقی پستی کا احساس دلایا اور دوسری طرف مغربی مستشرقین نے ایک ایسے ماضیٔ بعید کا خواب دکھایا جو حال اور ماضیٔ قریب سے مختلف اور خوشگوار تھا۔ سیاسی طاقتوں کے دباؤ سے اُن میں اپنی حالت بہتر بنانے کی خواہش بیدار ہوئی اور اپنے دل میں وہ اس یقین کو جگہ دینے لگے کہ الگ تھلگ رہنے ہی میں ان کا بھلا ہے اور ہندوستان کی دوسری جماعتوں کا مفاد قربان ہونے میں بھی اُن کا بھلا ہے۔

چنانچہ ہوا یہ کہ شروع ہی سے سماجی اخلاقی اور مذہبی اصلاح کی تحریکیں بجائے اس کے کہ وسطی دور کے کبیر نانک چیتنیہ اور تکارام جیسے مذہبی پیشواؤں کے نقش قدم پر چلتیں پُرانے زمانے کا اثر اور حوصلہ حاصل کرنے لگیں۔ ان مصلحوں میں سے راجہ رام موہن ہی وہ پہلے آدمی تھے جو بیک وقت سنسکرت فارسی اور عربی تینوں زبانوں کے بڑے عالم تھے لیکن بدقسمتی سے انھیں بھی ہندو سوسائٹی کو گندگیوں سے پاک کرنے میں انگریزوں کی امداد کی ضرورت ہوئی چنانچہ ان کی تمام تر توجہ قدیم ہندو گرنتھوں کے لئے وقف ہو گئی اور انھوں نے اپنی جماعت کے سامنے وہ نصب العین پیش کئے جو ویدوں اور اُپنشدوں کی زینت بنے ہوئے تھے۔ دیوندر ناتھ ٹیگور نے بھی جو یہ دیکھکر دلی تکلیف سے گھبرا اُٹھے تھے کہ ذہین اور روشن خیال ہندو عیسائیت کے حلقے میں داخل ہوئے جاتے ہیں یہی کیا کہ مذہب کے اُس زمانہ کے بگڑے ہوئے روپ سے بیزار ہو کر اُس شدھ اور بلند تر مذہب کی طرف رجوع کیا جو ہندو رشیوں کی پُرانی کتابوں میں بتایا گیا تھا۔ کیشب چندر سین اور زیادہ قدامت پسند واقع ہوئے تھے۔ لیکن انھوں نے ہندو ویشنومت کو عیسائی توحید سے ہم مشرب اور ہم کنار کر دیا۔ آریہ سماج کے بانی...... سوامی دیانند سرسوتی نے اپنی روح کی گہرائی اور پوری طاقت سے اس کا پرچار کیا کہ ویدوں کی تعلیم اور ان کی روح کو از سرِ نو حاصل کیا جائے۔ کرنل اولکاٹ، میڈیم بلیوٹسکی اور مسز بیسنٹ کی سرگردگی میں تھیوسافیکل سوسائٹی نے بھی مغربی سائنس کا جو اطلاق کیا تو وہ بھی ہندو رسم و رواج اور اداروں کے جواز میں کیا

اور یہ جواز پُرانوں اور دوسری مقدّس کتابوں میں تلاش کئے گئے۔ البتہ پرم ہنس رام کرشن نے سالہا سال اس کوشش میں گذارے کہ مسلمانوں سے مسجدوں میں اور عیسائیوں سے گرجاؤں میں بھائی چارہ اور ربط قائم ہوسکے، لیکن اُن کے بڑے شاگرد یا چیلے سوامی ویویکانند نے دیشنوں اور خاص طور پر ویدانت میں بتائے ہوئے درشنوں پر ....

.... طریق زندگی اور عبادت پر زور دیا۔

غرض بڑے پیشواؤں میں سے ایک ایک نے پلٹ کر مسلم دور سے پہلے کے ہندوستان کو آواز دی اور ایسے ماضی کی یاد تازہ کی جو خرد کی کور چشمی سے نہیں بلکہ جذباتی تصور کی چمک دمک میں نظر آسکتا تھا۔

اس طرح ہندوؤں کی پراچین تہذیب کو زندہ کرنے کی تحریک اور عیسائیوں کی مخالفت نے مسلمانوں میں اسی قسم کے ردّ عمل پیدا کئے۔ مسلم مبلغوں اور مصلحوں نے رسول اللہؐ کے قرونِ اولیٰ کے جانشینوں یا خلفائے راشدین کی سادگی اور ریاضت کی دعوت دی اور بعد کے مسلم حکمرانوں کی عیّاشی اور نزاکت کی مذمت کی۔

انیسویں صدی کے آخری دور تک ہندو اپنے ذہن کو ایک ایسے شاندار خیالی ماضی کے اونچے اونچے خوابوں سے مسخّر کرنے میں کامیاب ہوچکے تھے جو جنگل کے رشیوں کے مذہب اور فلسفہ پر مقالے (میمانسا) مکمل کرتے ہی ختم ہوگیا تھا۔ چند مسلمانوں نے بھی اسی ابتدائی تاریخ کی نیکی اور ریاضت کو صدا دی اور بعد کے کلچرل خلط ملط کو غیر اسلامی اور ایک لعنت قرار دیا۔

اپنی ابتدائی مذہبی زندگی کی سادگی اور نیکی کو زندہ کرنے کی مسلمانوں کی کوششیں یہیں ختم نہیں ہوئیں اور نہ انھیں جبر کی حدود میں مقید کیا جاسکتا تھا جبکہ ایک مرتبہ وہ چکر چل پڑا تھا۔ چنانچہ فطری طور پر مذہبی احیاء کی تحریک سے زندگی کی پوری ساخت یعنی اس کے سماجی معاشی اور کلچرل اجزاء کے زندہ کرنے کی بھی دعوت مل گئی۔ اُس زمانہ کی زندگی جبکہ لوگ نہایت پاکباز نیک اور خدا ترس ہوتے تھے۔

۱۹۰۵ء میں بڑے قومی انقلاب کی ابتدا ہوئی اور اُس نے لوکمانیہ بال گنگا دھر تلک، لالہ لاجپت رائے اور شری آربندو گھوش جیسے لیڈروں کو پیدا کیا لیکن ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی معنی میں پراچین تہذیب کو زندہ کرنے کا سخت حامی تھا۔ تلک .... مرہٹوں کے کارناموں سے اثر اور حوصلہ حاصل کرتے رہے۔ انھوں نے گنپتی تہوار اور شیواجی کی پوجا کو زندہ کیا اور گیتا رہسیہ" کے نام سے گیتا کی ایک تفسیر لکھی۔ لالہ لاجپت رائے تو آریہ سماجی عقائد کے بڑے مدّاح اور پرچارک تھے۔ آربندو گھوش نے تو شری کرشن کی ساری تعلیم بنگال کے انقلابی نوجوانوں کے گلے اُتار دی تھی۔ گھوش کے خیال میں ویاس، والمیکی اور کالیداس ان تین آدمیوں نے ہندو ذہن کے پردے کھولے اور ان کی تصنیفوں میں ہندوستانی تمدّن کی تاریخ کا ایک جبت بٹھایا گیا۔

بہت سے مسلم نوجوان بھی قومی تحریک کے رَو میں بہے اور ان میں ڈاکٹر محمد اقبال بھی تھے۔ چونکہ اقبال کی تعلیمات کا مسلم انڈیا پر بہت گہرا اثر ہوا اور اُن کے افکار نے موجودہ دَور میں مسلم ریاست کے قیام کا مباحثہ چھیڑے رکھا۔ اس لئے اُن کی ذہنی ساخت اور ارتقاء کے متعلق غور کرنا بے موقع نہ ہوگا۔ شروع شروع اقبال خالص قوم پرست تھے اُن کا دل پوری ہندوستانی قوم کی ترقی کے جذبہ کی حرارت سے دہک اٹھا تھا وہ اپنی شاعری کے نادر اور دلکش پیمانوں میں حبّ وطن کا دوآتشہ انڈیلا کرتے تھے "نیا شوالہ" "رام" "گایتری" اور دوسری نظمیں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کے دلوں کو گرماتی تھیں۔ ان نظموں کا یہ عالم تھا کہ وہ گھر گھر اور گاؤں گاؤں پھیلیں یہاں تک شمالی ہند کے بے شمار لوگوں کی زبانوں پر چڑھ گئیں۔

پھر ایک تغیّر آیا۔ قومی جوش و خروش اور ہنگاموں کا پہلا دَور ختم ہوا تو ذہنی فکر غالب آگئی اور یہ ایسی منزل تھی جہاں اُن کی فکر کا دھارا دونوں قوتوں سے متاثر تھا۔

اوّل تو یہ کہ ان کی فکر ہندوؤں کی اس پراچین تہذیب کو زندہ کرنے کی تحریک سے بہت زیادہ متاثر ہوئی جو قومیت بنگ بھنگ کی تحریک سے وابستہ یا اس کے لوازم میں سے تھی اس نے اس بات کو خواہ مخواہ اچھالا کہ بنگال کے تعلیم یافتہ طبقے کا اتحاد بکھر جائے گا۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندو ذہین طبقہ ولولہ انگیز ہندو تیت کی اٹھان کے جذبات میں رنگا ہوا تھا۔ اِن

حالات اور اس فضا میں کیا کچھ گذرا ہوگا۔ اس کا صحیح حال بپن چندر پال کے الفاظ میں پڑھئے۔

"اگر مسلم لیڈروں نے مرہٹوں اور سکھوں کے کارناموں کی یاد مٹانے کی کوشش کی تو ہندو قوم پرست لیڈروں نے اس یاد کو تازہ کرنے کا جتن کیا اور بلا شبہ قوم پرستی کے اس اعلےٰ پروپگنڈے کی ضرورت تھی۔ چونکہ یاد تازہ کرنے کا مقصد ایک ایسی قوم میں خود اعتمادی پیدا کرنا تھا جو یاس اور جمود میں مبتلا تھی تو اس سے فائدہ ہی ہوا نقصان نہیں۔ رفتہ رفتہ ہندو قوم پرستوں کی ایک جماعت میں یہ احمقانہ اور مہلک حوصلہ پیدا ہوا کہ ہندوستان میں ایک مرتبہ پھر ایک منفرد ہندو مملکت یا ہندو ریاستوں کا وفاق قائم کیا جائے۔ اس طرح چند لوگوں نے پوشیدہ طور پر یہ سمجھا کہ سوراج سے مراد "ہندو راج" کا قیام ہے "

چنانچہ اقبال نے انتہائی مایوسی کے عالم میں اس دھارے کا رخ کیا جس میں وہ افکار بہہ رہے تھے جن کا عالم اسلام سے بہت دور کا تعلق تھا۔ مثلاً کہاں جلال الدین رومی کا فلسفہ اور کہاں جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہٗ اور ترکی انقلاب کے لیڈروں کے ولولہ انگیز افکار جنھوں نے ساری ...... دنیا کے مسلمانوں کو اسلئے ابھارا کہ وہ مغرب کی محکومیت کے جوئے کو اُتار پھینکیں اور اُس دَور کے شاندار کارناموں کو دہرائیں جبکہ اسلام کا بڑھتا ہوا سیلاب ایشیا اور یورپ پر چھا گیا تھا۔

جلال الدین رومی کا فلسفہ اقبال کو نہیں بھایا، انھیں تو جمال الدین اور شیخ محمد عبدہٗ وغیرہ کے افکار نے گرویدہ کر لیا چنانچہ انھوں نے اپنے فلسفیانہ اور شاعرانہ ذہن کی تمام اہلیتوں کو اسلام کی خاطر وقف کر دیا۔ اُن کی جادو بیان شاعری اور شوخیٔ افکار کا جادو ۲۵ سال کے زاید زمانے تک مسلمانوں پر چھائے رہا۔ اس سے ایک اہم خدمت یہ ہوتی ہے کہ مسلمان خواب غفلت (Torpor) سے جاگ اٹھے اور احساسِ کمتری اُن سے سے رخصت ہوا۔ کیونکہ اُن کے سامنے ایک ایسی عالمگیر ملّت کا نصب العین پیش کیا گیا۔ جو مذہبی رشتوں میں منسلک اور حدودِ وطنیت سے آزاد ہوگی۔ پراچین سبھیتا کو زندہ کرنے کی جو تحریک بنگال میں اٹھائی گئی تھی اس کا فطری ردّ عمل احیاءِ اسلام کی تحریک میں نمودار ہوا۔ اس عمل سے پہلے ہی جماعتوں کے دل پھٹ رہے تھے لیکن اب وہ اور زیادہ تیزی سے پھٹنے لگے۔

اُن کی زندگی کے آخری زمانہ میں اُدھر موت کے لمبے سائے اُن پر پڑ چکے تھے اور اِدھر سبھیتا یا کلچر زندہ کرنے کی تحریک کا مہر نیم روز بھی ڈھل چکا تھا۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ جوانی کے زمانے کی قومیّت کی دبی ہوئی چنگاریاں پھر بھڑک اٹھیں تھیں۔ بعد کے کلام میں وہ اپنے ہندو ہم وطنوں سے ایک گہرے غم آشنا کے طور پر درد انگیز انداز میں اپیل کرتے ہیں کہ اگر وہ یہ چاہتے ہیں کہ غلامی کا خاتمہ ہو تو وہ اپنا اور پرایا، یگانہ اور بیگانہ کی دوئی کا نقش مٹا دیں، اس لئے کہ محبّت میں آزادی کا راز پوشیدہ ہے مسلمان شاخِ گل پر اپنا آشیانہ کیونکر بنائیں جبکہ انھیں یہ معلوم ہو کہ انھیں قفس کی پست اور ذلیل زندگی گذارنی ہوگی۔

یہ استغنا ہے پانی میں نگوں رکھتا ہے ساغر کو
تجھے بھی چاہئے مثلِ حبابِ آب جو رہنا
بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا
جو تو سمجھے تو آزادی ہے پوشیدہ محبت میں
غلامی ہے اسیرِ امتیازِ ما و تو رہنا
نہ رہ اپنوں سے بیگانہ اسی میں خیر ہے تیری
اگر منظور دنیا میں ہے او بیگانہ خو رہنا

اور ملاحظہ ہو۔

اے ہمالہ اے اٹک اے رودِ گنگ
زیستن تا کے چناں بے آب و رنگ
پیر مرداں از فراست بے نصیب
نوجوانان از محبّت بے نصیب
شرق و غرب آزاد و ما نخچیرِ غیر
خشتِ ما سرمایۂ تعمیرِ غیر
زندگانی بر مرادِ دیگراں
جاوداں مرگ است نے خوابِ گراں
ہندیاں با یک دِگر آویختند
فتنہ ہائے کہنہ باز انگیختند

۲۳

کس نداند جلوۂ آب از سراب
انقلاب، اے انقلاب، اے انقلاب

پھر فرماتے ہیں ؎

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن
ناقبول و ناامید و نامراد
ملّتے از کارشاں اندر فساد
الاماں از روحِ جعفر الاماں
الاماں از جعفرانِ ایں زماں

ضربِ کلیم میں وہ "شعاعِ امید" میں امید کی زبان سے ذیل کے اشعار ادا کرتے ہیں ؎

چھوڑوں نہیں ہند کی تاریک فضا کو
جبتک نہ اٹھیں خواب سے مردانِ گراں خواب
خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب
اس خاک سے اٹھیں ہیں وہ غواصِ معانی
جن کیلئے ہر بحرِ پُر آشوب ہے پایاب

غرض اس مردِ نیک باطن کی زندگی کے آخری دور میں حبِّ وطن کے ولولہ کی گرمی کا یہ عالم تھا لیکن اِن اشعار میں یہاں سے وہاں تک یاس اور قنوطیت کا ایک سا خط کھنچا ہوا ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسّی قومی مفاد کو بہت نقصان پہونچا۔ اقبال کی مشعل فروزاں کی روشنی میں دبی ہوئی فرقہ واریت عریاں ہوگئی اور فرقہ وارانہ آگ — .... کے لپلپاتے شعلوں نے چاروں طرف خطرہ اور خوف پیدا کیا۔ اگر ڈاکٹر (تعزّر) کوئی ڈکبیر پنتھ کے شنکر آچاریہ) اور ہندو مہاسبھا کے صدر نے یہ دعویٰ کیا کہ "ہندوستان میں ہندوؤں کا جو مذہب اُن کی جو نسل اور زبان ہے وہی قومی ہونی چاہئیں" تو لیگ نے بھی ترکی بہ ترکی ڈانٹ کر جواب دیا کہ وہ اس "ہندوستان" کے پرخچے اڑادیگی اور ایک ایسا پاکستان تعمیر کرے گی جو جہاں تک ہو سکے ہندو نسل ہندو مذہب اور ہندو زبان کے غلبہ سے پاک رہیگا۔"

جن منزلوں سے ہم گزرے اور جو درجہ ہم نے پانچسو برس سے زائد مدت میں "داد و ستد" کے باہمی...... جذبہ کے عمل سے تعمیر کیا وہ ایک صدی سے کم میں برباد ہو چکا ہے۔ سب سے زیادہ غمناک بات تو یہ ہے کہ دو جماعتوں کے مدّتوں کے تعلق کو ایک مسئلہ بنایا گیا۔ اور جسدِ ہند پر بے رحمی سے نشتر چلائے گئے۔ دو قوموں کے نظریہ کو خوب ہی اچھالا بھی تو گیا اور اس کا فطری نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو ذہن نے اپنا ردِّ عمل ظاہر کیا انگریزوں کے دورِ حکومت میں سو سال سے زاید جو عمل جاری تھا وہ تقریباً پایۂ تکمیل کو پہونچا۔

اب وہ وقت آگیا ہے کہ ہندوستان اور پاکستان کے اربابِ فکر اس مسئلہ پر غور کریں اور مغائرت اور منافرت کے اس عمل کی طنابیں کھینچ لیں۔ اس لئے کہ کلچرل اتحاد سے دونوں ملکوں کے متعدد سیاسی اور معاشی مسئلے حل ہو جائیں گے۔ اگر پاکستان اپنے معاشی اور مالی مسائل ہندوؤں کے تعاون کے بغیر حل نہیں کر سکتا تو ہندوستان کو بھی دفاع اور بیرونی ملکوں سے تعلقات کی خاطر مسلمانوں کی خدمات کی ضرورت ہے کیونکہ مسلمان ایک طرف ہندوستان اور دوسری طرف مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے ملکوں کے مابین ایک کڑی کا کام دے سکتے ہیں۔

خوش قسمتی سے ہندوستان میں ایسے سنجیدہ لوگ موجود ہیں جن میں غور و فکر کی صلاحیت ہے اور جن کی نگاہیں مستقبل پر لگی ہوتی ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ کلچرل اتحاد کو پھر سے قائم اور مستحکم کرنے کی یہ اپیل رائیگاں نہیں جائے گی۔

اوّل و آخر کی پروا عشق میں پوری وحشت ہی
یا فکرِ انجام نہ کر یا قیدِ آغاز اٹھا

ساغر

جگن ناتھ آزاد

سروجنی نائیڈو

کوئی پانچ منٹ تک گورنمنٹ ہاؤس کے پیچیدہ راستوں اور دروازوں سے گزرنے کے بعد گائڈ ایک کمرے کے سامنے رُکا اور کمرے کے اندر جانے کا اشارہ کرکے واپس لوٹ گیا۔

ہم ابھی دروازے پر ہی تھے کہ "آئیے جوش صاحب تشریف لائیے" کی آواز نے ہمارا استقبال کیا۔ سامنے صوفے پر شریمتی نائیڈو تشریف فرما تھیں۔ آپ نے ہاتھ جوڑ کر جوش صاحب کو نمسکار کیا۔ اُٹھنے کی کوشش کی لیکن جوش صاحب نے "تشریف رکھئے" کہہ کر انھیں روک دیا۔ آپ بیٹھ گئیں اور ساتھ کی کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "بیٹھئے"

تعارف کا رسمی سلسلہ دو ایک منٹ میں ختم ہو گیا۔ جوش صاحب نے مزاج پوچھا، کہنے لگیں "بیمار ہوں"۔ کوئی نصف منٹ تک کمرے میں، بالکل خاموشی رہی۔ پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولیں "آپ جوش صاحب کے ساتھ کام کرتے ہیں"

"جی ہاں" میں نے کہا اور "بساطِ عالم" کا نیا شمارہ انھیں پیش کیا، اسے دیکھتے ہی کہنے لگیں "یہ مجھے ملتا ہے باقاعدہ اور اس کے اکثر مضامین میں پڑھتی ہوں۔ ہاں یہ شمارہ نیا ہے میں نے ابھی نہیں دیکھا" یہ کہہ کر انھوں نے پرچہ قریب ہی صوفے پر رکھ دیا اور جوش صاحب کی طرف متوجہ ہوئیں۔

میں زندگی میں پہلی بار ایک گورنر سے ملاقات کر رہا تھا۔ گورنروں کے متعلق سنا تو بہت کچھ تھا لیکن انھیں قریب سے دیکھنے کا اتفاق کبھی نہ ہوا تھا۔ اور جو کچھ سنا تھا اس سے یہاں صورت مختلف تھی۔ کبھی میری نظروں کے سامنے وہ فوجی وردی میں ملبوس سکریٹری آجاتا تھا جو دو ایک بار کمرے میں داخل ہوا اور جو ہر بار ایک سپاہیانہ سلیوٹ کر کے واپس گیا۔ اور کبھی سروجنی نائیڈو کے یہ اشعار میرے ذہن میں آجاتے تھے۔

"O I am tired of painted roofs and
soft and silken floors,
and long for the wind blown
canopies of crimson gulwohurs:
O I am tired of strife and song
and festival and fame
and long to fly where cassiawoods
are breaking into flame"

یہ ایک عجیب تضاد تھا جو میری سمجھ سے بالا تھا۔ لیکن کمرے کے ماحول اور ان اشعار میں ایک مطابقت بھی تھی وہ کمرہ اور اس کا ساز و سامان اتنا سادہ تھا کہ اس پر گورنمنٹ ہاؤس کے کمرے کا کسی طرح بھی گمان نہ ہوتا تھا۔ فرش پر کوئی دری یا قالین نہ تھا۔ دیواروں پر کوئی تصویر نہ تھی۔ جھاڑ فانوس کہیں نظر نہ آرہے تھے۔ کرسیاں سادہ میز معمولی قسم کی صوفہ بھی جس پر شریمتی نائیڈو بیٹھی تھیں ایسا تھا جیسے عام گھروں میں ہوتا ہے۔ گویا کوئی ایسی چیز کمرے میں موجود نہ تھی جو "گورنری" کے لفظ کے ساتھ کسی قسم کی مطابقت رکھتی ہو۔ معلوم نہیں گورنمنٹ ہاؤس کا آرائشی ساز و سامان کانگرس کے برسرِ اقتدار آنے کی وجہ سے ہٹا لیا گیا تھا یا سروجنی نائیڈو نے اپنے کمرے سے اس قسم کی چیزیں اُٹھوا دی تھیں۔ بہر طور وہ کمرہ soft and silken floors اور painted roofs، سے بالکل عاری تھا۔

"کہئے آپ کا مزاج کیسا ہے۔ سرکاری دفتر کے ماحول کو پسند کرتے ہیں آپ؟"

جوش صاحب نے موجودہ نظام پر ایک ہلکی سی چوٹ کرتے ہوئے کہا "دفتر میں مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں ہو رہی ہے ایک تو رفیق اچھے ملے ہوئے ہیں۔ دوسرے کام لکھنے پڑھنے کا ہے

لہٰذا میں یہاں غیر مطمئن نہیں۔ لیکن ہندوستان کا موجودہ نظام میرے لئے بہت تکلیف دہ ہے۔ خیال یہ تھا کہ آزادی کے بعد علم و ادب کا رتبہ ملک میں بہت بلند ہوگا اور ادیب اور شاعر زیادہ عزت اور اطمینان سے زندگی بسر کر سکیں گے لیکن خلاف توقع ایسا ہوا نہیں۔ ایک آزاد ملک میں ادیبوں اور شاعروں کو جو مراعات حاصل ہونا چاہئیں وہ ہندوستان میں ابھی حاصل نہیں ہوئیں۔

آپ نے ایک لمحہ توقف کیا اور بولیں کہ آزاد ہوتے ہی ملک ایسے جھمیلوں میں گرفتار ہوگیا ہے کہ بعض تعمیری کاموں کی جانب وہ توجہ دینا مشکل ہوگیا ہے جس کے یہ مستحق ہیں۔ ...... علم و ادب کی نشر و اشاعت اور اس کی سرپرستی بھی ایسے ہی تعمیری کاموں میں ہے جن کی جانب حکومت توجہ دینا چاہتی ہے لیکن سیاسی الجھنوں کی وجہ سے مجبور ہے۔ اس کے باوجود مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ حالات سدھرنے میں بہت دیر نہ لگے گی۔

یہاں جوش صاحب نے ہندوستان میں اُردو کے مستقبل کا ذکر کیا اور کہا کہ مجھے تو یہ کشتی ڈوبتی نظر آتی ہے۔

آپ بولیں "نہیں آپ کا خیال غلط ہے اُردو کا مستقبل اس ملک میں بہت روشن ہے۔ ذرا فرصت ملے تو میں اس ذمہ داری کو ہاتھ میں لوں گی۔ مجھے اس معاملے میں پنڈت جی سے بھی بات چیت کرنا ہے۔ میں چاہتی ہوں کہ اُردو کے تحفظ کے لئے یہاں ایک مستقل ادارہ قائم ہو جائے۔

آپ تھوڑی دیر تک گفتگو کرنے کے بعد تھک جاتی تھیں اور ایک آدھ منٹ کے توقف کے بعد پھر گفتگو شروع کرتی تھیں۔ آپ کے چہرے پر بھی تھکاوٹ کے آثار نمایاں تھے لیکن اس تھکاوٹ کے پردے میں عظمت بدستور جھلک رہی تھی۔

اب کے توقف کے بعد آپ نے کہا "ساغر صاحب کہاں ہیں آجکل اور کیا حال ہے ان کا" جوش صاحب بولے بمبئی میں ہیں اور حال ان کا وہی ہے جو دوسرے ادیبوں کا اور شاعروں کا ہے۔ وہ پھر "ایشیا" جاری کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ لیکن حکام بالا کی بے توجہی دیکھئے کہ وہ انہیں ٹیلیفون کا کنکشن تک نہیں دے رہے۔ اب جس ملک میں شاعروں کے ساتھ یہ سلوک ہو وہاں کوئی کیا زندگی بسر کرے۔ اگر ان چھوٹی چھوٹی باتوں کے لئے وزراء سے کہا جائے تو یہ چیز معیوب نظر آتی ہے اور اگر نہ کہا جائے تو انھیں حقیقت حال معلوم نہیں ہوتی اور نچلے طبقے میں شاعر اور ادیب کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی۔ اب قدوائی صاحب سے میں نے کہا ہے انھوں نے جواب دیا ہے کہ ساغر صاحب کی ادبی خدمات کی قدردانی لازمی ہے۔ میں کوشش کروں گا کہ انھیں کنکشن مل جائے۔ اب معلوم نہیں ان کی کوشش بارآور ہوتی ہے یا نہیں۔"

آپ نے کہا نہیں میں کچھ اور سوچ رہی ہوں۔ میں ساغر صاحب کے لئے کوئی اور مستقل صورت پیدا کرنا چاہتی ہوں۔ یہ کہہ کر آپ نے اپنے سکریٹری سے کہا کہ لکھنؤ چل کر مجھے دو باتیں یاد دلائیے ایک ساغر صاحب کا کام، دوسرا "آجکل" کے لئے نظم۔ سکریٹری نے یہ ہدایت اپنی ڈائری میں نوٹ کر لی۔

اس کے بعد آپ نے میری طرف توجہ کی اور کہا کہ آپ کا کلام تو میں اُردو رسائل میں دیکھتی رہتی ہوں لیکن کوئی کتاب آپ کی غالباً ابھی تک نہیں چھپی۔ میں نے کہا جی کتاب تو نہیں ہاں ایک کتابچہ حکومتِ کشمیر نے شائع کیا ہے جس میں تمام تر نظمیں جنگِ کشمیر کے متعلق ہیں۔ یہ کہہ کر میں نے "طبل و علم" کی ایک جلد انھیں پیش کی۔ آپ نے سرسری طور پر ورق گردانی کی۔ ایک صفحے پر آکر آپ رک گئیں اور یہ تین مصرعے

"جس طرف بھی دیکھئے ہے لالہ و گل کا ہجوم،
لالہ و گل میں دمکتی ہے جبیں کشمیر کی
مسکرا اے لیلیٰ محمل نشیں کشمیر کی"

پڑھ کر محض ایک قدرے طویل "ہوں" کی۔ اس پر جوش صاحب بولے آزاد ہمارے بہت اچھا لکھنے والوں میں ہیں۔ آپ کچھ کہنا ہی چاہتی تھیں کہ اچانک ان کا ملٹری سکریٹری (یا پرائیویٹ سکریٹری — بہر طور وہ تھا فوجی لباس میں) اندر داخل ہوا اور بولا۔

"There is a trunk call from the Lucknow University they are reminding you of your participation in the function on the due dete"

آپ نے فوراً ہی کہا

No, I am not coming Ask them not to weste money on trunk call like that

سکریٹری باہر چلا گیا۔ آپ نے دروازے پر نظریں جمائے ہوئے کہا۔

why do these people wast money on trunk call.

اس کے بعد جوش صاحب نے پھر ساغر صاحب کا ذکر کیا آپ بولیں "مجھے یاد رہے گا آپ مطمئن رہیں" اور بات چیت کا رُخ بدل لیا۔ جوش صاحب نے پوچھا "دہلی میں قیام کب تک رہے گا۔ بولیں "کل صبح واپس جا رہی ہوں۔"

"ہوا سے ؟"

"جی نہیں — ریل گاڑی سے۔ مجھے تو ڈاکٹروں نے ریل کا سفر کرنے کی اجازت بڑی مشکل سے دی ہے۔ ہوا میں تو میں ایک لمحہ بھی نہیں ٹھیر سکتی۔"

چونکہ بات چیت میں تقریباً ایک گھنٹہ صرف ہو گیا تھا لہٰذا ہم نے اجازت طلب کی۔

باہر آتے ہی میں نے جوش صاحب سے کہا کہ آپ تو کہتے تھے کہ اقتدار حاصل کرتے ہی ان لوگوں کی نگاہیں بدل گئی ہیں۔ صرف جواہر لال ہی ایسے ہیں جو بے شراب پی کر نہیں جھومے باقی سب جھوم اُٹھے ہیں۔ لیکن یہاں تو معاملہ بالکل مختلف نظر آیا۔ مجھے تو یہاں کوئی ایسی بات نظر نہیں آئی۔

جوشؔ صاحب بولے معلوم نہیں میں نے کس عالم میں یہ کہا تھا۔

اس خوشگوار ملاقات کے چند دن بعد خبر آئی کہ سروجنی نائیڈو انتقال فرما گئیں۔ جوش صاحب اس دن لکھنؤ میں تھے دہلی آئے تو میں نے دیکھا کہ اُداسی اور افسردگی کے سمندر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ میں نے گورنمنٹ ہاؤس کی ملاقات کا ذکر کیا۔ آپ نے ایک طویل ٹھنڈی سانس لی اور چپ چاپ اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔

میں نے کہا پرسوں "آجکل" کا نیا شمارہ چھپ جائے گا اس میں سروجنی نائیڈو کے متعلق آپ کے قلم سے ضرور کچھ نہ کچھ ہونا چاہیئے۔ آپ چند سطور لکھ دیں۔ بولے مجھ سے کچھ نہیں لکھا جائے گا آپ ہی لکھ دیں۔ میں نے بہت اصرار کیا کہ نہیں آپ ہی لکھیں۔ جو کچھ آپ لکھیں گے اس میں Personal touch کی وجہ سے خاص بات پیدا ہو جائے گی۔ چنانچہ آپ نے میرے اصرار سے "بلبلِ ہند" کے عنوان سے ایک صفحہ لکھا۔ آخر میں آپ نے اپنے غمِ دِل کا اظہار ان لفظوں میں کیا۔

"افسوس کہ ہندوستانی شاعروں کا اب کوئی قدرداں باقی نہیں رہا۔ اس پورے برّاعظم میں نہ کوئی مرد ہی نظر آتا ہے نہ کوئی عورت ہی دکھائی دیتی ہے جو مسز سروجنی نائیڈو کی طرح شاعروں کی قدر کرے اور ان کے ناز اُٹھائے۔ ع

اِک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے"

مسز سروجنی نائیڈو نے ۱۳ فروری ۱۸۷۹ء کو حیدر آباد (دکن) کے ایک بنگالی گھرانے میں جنم لیا۔ آپ کے والد شری اگھورے ناتھ چٹوپادھیائے نظام کالج کے پرنسپل تھے۔ آپ ہندوستان کے مشہور دھارمک لیڈر شری کیشب چندر سین کی زندگی سے متاثر ہو کر برہمو سماج کے حلقے میں داخل ہوئے۔

مسز نائیڈو کی والدہ کی تعلیم و تربیت بھی شری کیشب چندر سین کے قائم کئے ہوئے تعلیمی ادارے بھارت آشرم کلکتہ میں ہوئی تھی۔ والدین کی زندگی کا اثر بیٹی پر بھی پڑنا ضروری تھا۔ چنانچہ ننھی نائیڈو بھی برہمو سماج کی تعلیم سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی اور سیاسیات اور ملک کے سوشل کاموں میں آپ کی فراخ دلی اور کشادہ نظری بہت حد تک اسی تعلیم کا نتیجہ ہے عالمگیر برادری کا اصول جو برہمو سماج کی تعلیم کی بنیاد کہا جا سکتا ہے بہت حد تک آپ کی طبیعت میں گھر کر گیا۔ عالمگیر محبّت کا جذبہ آخری دم تک آپ کی زندگی کا جزو بنا رہا۔ اور اس زمانے میں بھی جب کہ تقسیم کے دنوں میں بدنصیب ہندوستان میں فرقہ وارانہ ذہنیت اپنے عروج پر پہونچ گئی تھی آپ کا دامن اس گرد سے بالکل ملوّث نہ ہوا۔ اور آپ ہر فرقے اور ہر مذہب کے افراد کے ساتھ خلوص اور محبّت سے پیش آتی رہیں۔ جس کے لئے آپ کے خاندان نے ہندوستان بھر میں خاص نام پیدا کیا ہوا تھا۔ مذہبی اور صوبائی تعصب کو آپ ہندوستان کے لئے زہرِ قاتل سمجھتی تھیں اور ہمیشہ اس کوشش میں رہیں کہ

غیر ملکی غلامی کے ساتھ ہندوستان غیر ملکی سیاست کی
پیدا کی ہوئی ان دو لعنتوں سے بھی نجات حاصل کرلے۔ اس
مقصد کے پیش نظر آپ نے ۱۹۲۶ء میں عالمگیر دھرموں کی
کانفرنس کا افتتاح کیا اور افتتاحی تقریر میں ہندوستان کے
تمام مذاہب کے ماننے والوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنی صحیح اور
سچی تعلیم لے کر میدان میں آئیں اور ملک کو تعصب اور تنگ
نظری کے پھندے سے نجات دلائیں۔

آپ نے فقط تعصب اور فرقہ واریت کے خلاف ہی
اپنی آواز نہیں اٹھائی بلکہ سماج کے بوسیدہ بندھنوں کے
خلاف بھی علم بغاوت بلند کیا۔ ۱۸۹۸ء میں آپ کی شادی ہوئی
اور یہ شادی اس وقت کے فرسودہ نظام کے خلاف ایک کھلی
بغاوت تھی۔ آپ خود ایک بنگالی برہمن کے گھر پیدا ہوئیں لیکن
رفیق حیات کے طور پر آپ نے ایک غیر بنگالی اور غیر برہمن
شخص ڈاکٹر نائیڈو کو جو بعد میں میجر بن گئے منتخب کیا۔

عورتوں کی حق تلفی کی بھی آپ نے بڑی شدومد سے
مخالفت کی اور طبقۂ نسواں کی وکالت کے لئے آپ مانٹیگو ساؤتھ
برو کمیٹی اور پارلیمنٹری جوائنٹ کمیٹی کے سامنے پیش ہوئیں۔
آپ کی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر مانٹیگو نے آپ کو انقلابی
عورت کا خطاب دیا۔

آپ نے ایک موقعہ پر بڑے فخر سے کہا تھا کہ میں اس
صنف سے تعلق رکھتی ہوں جس میں سیتا جیسی مائیں ساوتری
جیسی بہادر شخصیتیں اور دمینتی دھرماتما ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔

سیاسیات کے جسم میں آپ نے اپنے جوش عمل سے
ایک نئی روح پھونک دی۔ آپ کا جذبۂ حب وطن بے حد
و بے پایاں تھا اور آپ کی شاعری میں یہ جذبہ خاص طور پر
نمایاں نظر آتا ہے۔ ایک نظم میں آپ مادر وطن سے خطاب
کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

Lo! we would thrill the bright
stars with thy story
and set thee again the
prepoint of glory

اس قول کو آپ نے مرتے دم تک نباہا۔ آپ نے اپنے
دلکش نغموں سے ملک میں چاروں طرف حب الوطنی کی آگ
لگادی۔ نغمہ اور خطابت دونوں طرح سے آپ نے وطن کے
دلوں کو گرمایا۔ ۱۹۰۶ء میں گوپال کرشن گوکھلے نے آپ کی ایک
تقریر سن کر کہا تھا "آپ کی تقریر فقط خرد اور دانشمندی کا
نمونہ ہی نہیں تھی۔ بلکہ فنی اعتبار سے بھی ایک مکمل چیز تھی۔ ہم
سب سننے والوں کو ایسا محسوس ہوا گویا ہم زمین کی سطح سے
بلند اٹھ گئے ہیں۔" دس سال بعد پنڈت جواہر لال نہرو نے ایک
موقع پر کہا "سروجنی نائیڈو کی تقریریں قوم پرستی اور حب الوطنی
کا مجموعہ ہوتی ہیں۔"

۱۹۱۹ء میں آپ کی زندگی میں ایک عظیم تبدیلی رونما
ہوئی۔ آپ اس وقت لندن میں صاحب فراش تھیں۔ پنجاب
کے حادثے کے متعلق پارلیمنٹ کی بحث نے آپ کی رہی سہی امیدوں
پر بھی پانی پھیر دیا۔ ان حالات میں آپ نے ۱۵ جولائی ۱۹۱۹ء
کو مہاتما گاندھی کو ایک چٹھی لکھی جس میں آپ نے لکھا۔

"اگلے دن ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے میں
نے کہا کہ ہندوستانی انتقام نہیں لینا چاہتے بلکہ یہ چاہتے ہیں
کہ ان پر جو مظالم ہوئے ہیں ان کی تلافی کی جائے۔ ہندوستانیوں
کے پاس ایک ایسا جادو ہے جس کی مدد سے وہ ہر قسم کی دشمنی
اور نفرت کو محبت اور دوستی میں تبدیل کر سکتے ہیں اور یہ
محبت اور دوستی ہندوستانیوں اور انگریزوں دونوں کیلئے
مفید ثابت ہو سکتی ہے۔ اس حادثۂ عظیم کی تلافی محض اس
صورت میں ہو سکتی ہے کہ ہندوستانیوں کو آزاد ملک کے آزاد
باشندوں کی طرح رہنے کا حق دیا جائے۔

ڈاکٹروں نے مجھے بتایا کہ میری دل کی بیماری بہت
خطرناک صورت اختیار کر چکی ہے لیکن میں اس وقت تک آرام
سے نہ بیٹھوں گی جب تک میں دنیا کو یہ نہ بتا لونگی کہ ہندوستان
کی اس ٹریجیڈی کی تلافی کا واحد طریقہ یہ ہے کہ وہ عملی طور پر
اس کا کفارہ ادا کریں۔"

اس کے بعد آپ نے جدوعمل کو شعر و سخن پر ترجیح
دیتے ہوئے اسی مرد عظیم کے پہلو بہ پہلو کام کرنا شروع کر دیا
جس کے نام آپ نے مندرجہ بالا چٹھی لکھی تھی۔ صحت کی خرابی
آپ کو کسی قسم کی صعوبت برداشت کرنے سے نہ روک سکی
آپ نے گاندھی جی کے ساتھ ہر قسم کی تکلیف برداشت کی اور
منزل آزادی کی راہ میں بڑی سے بڑی قربانی کرنے سے بھی

کبھی دریغ نہ کیا۔

شریمتی شتشا سین ایم۔ ایل۔ اے بہار نے مسز نائیڈو کے متعلق ایک مقالہ سپردِ قلم کرتے ہوئے ان کی زندگی کے ایک نہایت حسین گوشے کو اجاگر کیا ہے۔ آپ لکھتی ہیں کہ آپ ایک آئیڈیل ماں تھیں۔ اس لحاظ سے صرف پدمجا اور لیلامنی ہی خوش نصیب نہیں کہ انھیں مسز نائیڈو جیسی ماں ملی بلکہ ہندوستان کے وہ تمام لڑکے اور لڑکیاں خوش نصیب ہیں جنھیں مسز نائیڈو نے اپنی اولاد کہا اور ایک شفیق ماں کی طرح ان کی پرورش کی۔ غالباً اُن کا یہی جذبۂ محبّت تھا جس کے باعث آپ نے یو پی کی گورنر بننے پر کہا تھا کہ میں اس صوبے کی گورنر نہیں بلکہ گورنیس ہوں۔ اور ان کی گورنری کا زمانہ اس بات کا شاہد ہے کہ انھوں نے اس دَور میں یو پی کے ہر باشندے کو اپنی اولاد سمجھا اور ایک شفیق ماں کی طرح ان کا دُکھ درد دُور کرنے میں ہمیشہ کوشاں رہیں۔

یہی عالمگیر محبّت کا جذبہ تھا جس نے شعر و نغمہ کا روپ بھر کے سروجنی نائیڈو کو بلبلِ ہند کے طور پہ دنیا کے سامنے پیش کیا۔ آپ کی شاعری حُسن، محبّت اور غم کا ایک دلکش امتزاج پیش کرتی ہے۔ اس کی ابتدا آپ کے لڑکپن میں ہی ہوئی۔ اس سلسلے میں ایک عجیب وغریب واقعہ سننے میں آیا ہے جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

کہتے ہیں کہ نو برس کی عمر میں جب آپ کو گھر میں ہر وقت انگریزی بولنے پر مجبور کیا گیا تو آپ نے پہلے تو جھجک دکھائی اور پھر مصمّم عزم کر کے انگریزی بولنے سے بالکل انکار کر دیا۔ اس جرم میں گھر والوں نے آپ کو ایک کمرے میں بند کر دیا جب شام کے وقت آپ کو کمرے سے باہر نکالا گیا تو آپ نے اس بے تکلفی سے انگریزی میں بات چیت شروع کر دی گویا انگریزی آپ کی مادری زبان ہو۔ چند دن بعد آپ الجبرے کا ایک سوال حل کر رہی تھیں۔ بڑی کوشش کے باوجود الجبرے کا سوال تو حل نہ ہوسکا لیکن انگریزی میں اشعار خود بخود موزوں ہونے لگے اور تھوڑی دیر میں صفحۂ قرطاس پر ایک مکمل نظم موجود تھی۔ اس کے بعد شعروشاعری کا سلسلہ باقاعدگی سے شروع ہوگیا اور آپ بطور شاعرہ پردۂ گمنامی سے منظرِ عام پر آگئیں۔

سترہ سال کی عمر میں آپ نے حصولِ تعلیم کیلئے انگلستان کا سفر کیا۔ وہاں آپ تین سال تک کنگز کالج لندن اور کیمبرج میں تعلیم حاصل کرتی رہیں اور اسی دوران میں آپ کی آرتھر سائمنز اور ایڈمنڈ گاس سے ملاقات ہوئی۔ ان دونوں حضرات نے آپ کی شاعری کا رخ انگلستانی انداز سے ہندوستانی انداز کی جانب موڑنے میں کافی حصّہ لیا۔ ان کے مشورے کے بعد سروجنی کی شاعری میں 'رابن' اور 'سکائی لارک' کی جگہ کوئل اور دوسرے ہندوستانی پرندوں نے اور انگریزی پھولوں کی جگہ چمپا اور گلاب نے لے لی۔ گویا انگلستان جاکر شاعرہ کے طور پر آپ کا دوبارہ جنم ہوا۔

آپ کا کلام اس وقت تین مجموعوں "سنہری دہلیز" the golden threshold (۱۹۰۵ء) "طائرِ وقت" the Bird of time (۱۹۱۲ء) اور "بالِ شکستہ" the Broken wing (۱۹۱۷ء) کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ "سنہری دہلیز" کی اشاعت تک آپ کو بطور شاعرہ کوئی خاص شہرت حاصل نہیں ہوئی تھی لیکن جب یہ کتاب انگلستان میں پہنچی تو وہاں کے اہلِ نظر طبقہ نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور ادبی جرائد میں اس کے متعلق نہایت قابلِ قدر تبصرے شائع ہوئے۔ ایک رسالے نے لکھا کہ یہ چھوٹا سا مجموعۂ سخن اس اعتراض کا مسکت جواب ہے کہ عورتیں شعر نہیں کہہ سکتیں۔ ایک اور جریدے نے لکھا "آپ کی شاعری میں نغماتی کیفیات کا ایک طوفان موجزن ہے۔ آپ کا بلند پرواز تخیّل اور شدید جذباتی کیفیت ایک انوکھی ادا سے پردۂ تغزّل میں زمزمہ پرداز ہیں۔ ایک اور رسالے نے اس مجموعے کے متعلق یہ الفاظ لکھے "حُسن اور انفرادیت جس سے انکار نہیں ہو سکتا۔"

"طائرِ وقت" اس سے سات سال بعد شائع ہوئی اس کا پیش لفظ ایڈمنڈ گاس نے لکھا۔ ایڈورڈ تھامس نے اس مجموعے کے متعلق کہا کہ اس کے الفاظ میں حسن اور معانی میں عظمت پنہاں ہے۔

"بالِ شکستہ" ۱۹۱۷ء میں چھپی۔ اس کے بعد آپ کا کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔ بالِ شکستہ کی اشاعت کے بعد نظمیں تو آپ نے اکثر کہیں لیکن انھیں یکجا کر کے مجموعے کی صورت نہیں دی۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ سیاسی سرگرمیاں انھیں شعروسخن کے ماحول سے بہت دُور لے گئیں اور ڈاکٹر امرناتھ جھا

کے الفاظ ہیں اگر آپ اپنی قوت اسمبلی اور کونسل ہال کی تقریروں اور حصولِ آزادی کے لئے عوام کی عملی تنظیم میں صرف نہ کر دیتیں تو اس وقت تک انگریزی ادب میں بے شمار آسمانی نغمات کا اضافہ ہو چکا ہوتا۔ ڈاکٹر جھا نے آپ کی موت کے بعد آپ کی شاعری کے متعلق ایک مختصر سا مقالہ لکھا ہے جس کا ایک حصّہ میں یہاں درج کرتا ہوں۔

"مسز نائیڈو کی سخن گوئی کی ابتدا بہاریہ نظموں سے ہوئی۔ یہ نظمیں تعداد میں کم از کم تیرہ ہیں اور ان میں آپ نے نہایت خوبصورتی سے مناظر کی تصویر کشی کرتے ہوئے فطرت کی آواز اور بُو کو بھی سمو دیا ہے۔ اس کے علاوہ آپ نے اپنے کلام میں خالص ہندوستانی زندگی کی عکاسی بھی کی ہے۔ اس ضمن میں آپ کے عوامی گیت اور تاریخی اور نیم تاریخی نظمیں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ "دیہات" اور "بچے" بھی آپ کا خاص موضوع ہیں لیکن جس موضوع پر آ کر آپ کے فکر و نظر کا مطالعہ بہت شدید صورت اختیار کر جاتا ہے وہ ہے "عشق و محبّت" اور عشق و محبت بھی وہ جسے جاوداں اور ہر دم جوان کہہ سکیں۔

اپنی پہلی تصنیف "طائرِ وقت" میں آپ نے جو اندازِ بیان اختیار کیا ہے اس کے متعلق یہ تنقیدی جملہ بہ آسانی کہا جا سکتا ہے کہ حسنِ الفاظ اکثر حسنِ تغزل پر سبقت لے گیا ہے۔ لیکن دوسری کتاب "سنہری دہلیز" میں تازگی بے ساختگی اور ندرتِ فکر کا عنصر بہت بڑھ گیا ہے اور اس کتاب میں "اختلاطِ حرف و معنیٰ" صحیح معنوں میں "ارتباطِ جان و تن" کی صورت اختیار کئے ہوئے نظر آتا ہے۔ "بالِ شکستہ" میں پختگیٔ کلام شدّتِ تاثیر دونوں اپنے شباب پر نظر آتی ہیں۔

ایک خوبی جو اِن تینوں کتابوں میں خاص طور پر دکھائی دیتی ہے وہ ہے خوبصورت ٹکڑوں اور ترکیبوں کا استعمال خوبصورت ٹکڑوں کے استعمال میں مسز نائیڈو کو یدِ طولیٰ حاصل ہے اور کلام میں یہ حسن پیدا کرنا ہر فن کار کے بس کی بات نہیں۔ ان حسین ٹکڑوں میں سے بعض ملاحظہ فرمائیے۔

'Like a star in the dew of our song';
'Silver breasted moonbeam of desire';
'Conquer the sorrow of life with the sorrow of song';
'a voiceless captive to my conquering song';
'brows anointed with perpetual weariness';
'all my blossoming hopes unharvested';
'languid and sequestered ease';
'Tomorrow's unborn griefs depose the sorrow of our yesterday';
'the heavenward hunger of our soul';
'the mystic silence that men call death';
'the abysmal anguish of her tears';
'the memoried sorrow that sullied a by-gone age';
'the moon enchanted estuary of dreams';
'the glimmering ghost of bygone dream';
'the radiant promise of renascent morn';
'Sweet comrades of a lyric spring';
'the radiant silence of my sleepless pain';
'fallen from its high estate of laughter';
One can cull such gems in ample measure;
It's sufficient to say that here is God's plenty.

اگرچہ آپ کی اکثر نظموں کا موضوع حزن والم ہے اور یہ نظمیں اوّل سے آخر تک آنسوؤں میں بھیگی ہوئی نظر آتی ہیں لیکن اس کے باوجود آپ زندگی کے حسن اور اس کی لطافتوں اور اس کے تبسم اور قہقہوں سے کبھی غافل نہیں رہیں۔ آپ کے کلام کے مطالعہ کے بعد انسان اس نتیجے پر پہونچتا ہے کہ آپ نے نغمے کی قوّت سے زندگی کے تلخ اور علیل پہلوؤں پر فتح حاصل کرلی ہے۔ حبِّ وطن کے بے پناہ جذبے نے آپ میں جو عظیم جرأت پیدا کردی تھی اس نے آپ کو ہر خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار کرلیا تھا اور یہ خصوصیت آپ کے کلام میں بھی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ بطور شاعرہ کے آپکی بلند مرتبتی دیکھنے کے لئے مندرجۂ ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے۔ نغمے کا بہاؤ اور خیالات کی سنجیدگی دونوں ایک دوسرے پر غالب آنے کیلئے کوشاں نظر آتے ہیں۔

Weavers, weaving at break of day,
Why do you weave a garment so gay?
Blue as the wing of a halcyon wild,
We weave the robes of a new-born child.

Weavers, weaving at fall of night,
Why do you weave a garment so bright?
Like the plumes of a peacock, purple & green,
We weave the marriage-veils of a queen.

Weavers, weaving solemn and still,
What do you weave in the moonlight chill?
White as a feather and white as a cloud;
We weave a dead man's funeral shroud.

ایک اور نظم دیکھئے۔

O brilliant blossoms that strew my way,
You are only woodland flowers they say.
But, I sometimes think that perchance you are
Fragments of some new-fallen star:

Or golden lamps for a fairy shrine,
Or golden pitchers for a fairy wine,
Perchance you are, O frail and sweet
Bright anklet-bells from the wild spring's feet,

Or the gleaming tears that some fair bride shed
Remembered her lost maidenhead
But now in the memorial dusk you seem
The glimmering ghost of a bygone dream.

"پردہ نشیں"، "گلی کی آوازیں"، "چوڑیوں والا" "امام باڑہ" اور ایسی ہی دیگر نظمیں اس دعوے کا بیّن ثبوت ہیں کہ سروجنی نائیڈو کا انداز بیان خود ان کی اپنی ایجاد ہے اور آپ کا طرزِ سخن کسی اور فنکار کا مرہونِ منت نہیں۔ آپ کا انداز بھی اپنا ہے اور موضوعات بھی، نغمے بھی اور نالے بھی۔ ابتدا میں اگرچہ ٹینی سن۔ شیلے اور سوئن برن کے اسٹائل سے آپ متاثر نظر آتی ہیں لیکن بعد میں آپ کا طرزِ کلام کسی اور کا تتبع نہیں بلکہ خود نائیڈو کی تخلیق اور نائیڈو کی ہی نمائندگی کرتا ہے"۔

آپ جب کسی مجمع میں اپنے اشعار پڑھتی تھیں تو ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے سارے مجمع پر کسی نے جادو کر دیا ہے نغمے کا سیل رواں خاموش فضا میں.... ایک نرالی کیفیت پیدا کر دیتا تھا۔ اور جب تک آپ اپنی نظم ختم نہ کر لیتیں تھیں سننے والے بے حس و حرکت ایک عجیب عالم میں رہتے تھے۔

راقم نے ۱۹۳۳ء میں بریڈ لا ہال لاہور کے مشاعرے میں جو شاعرِ اعظم رابندر ناتھ ٹیگور کے اعزاز میں مسز نائیڈو کی زیرِ صدارت منعقد ہوا تھا۔ آپ کا کلام آپ کی زبان سے سنا تھا۔ اس وقت کی کیفیت میرے احساس میں آج بھی زندہ و بیدار ہے لیکن میں اسے بیان کرنے سے قاصر ہوں۔

مذکورہ اجتماع لاہور کی ادبی زندگی میں ایک تاریخی حیثیت رکھتا تھا۔ کیونکہ اس میں اُردو کے بڑے بڑے شعراء کے علاوہ ٹیگور اور نائیڈو نے بھی اپنا کلام پڑھا تھا۔ اس مشاعرے میں بھی مسز نائیڈو کی اُردو سے دلچسپی کا ایک ثبوت دیکھنے میں آیا۔

وہ یہ کہ منتظمین مشاعرہ کی بد انتظامی کہئیے یا خوش انتظامی کہ مشاعرہ سننے کی آرزو میں سرِ شام سے ہی لاکھوں اشخاص جوق در جوق بریڈ لا ہال کے احاطے میں جمع ہونے شروع ہو گئے مشاعرہ شروع ہونے تک بریڈ لا ہال میں تل دھرنے کو جگہ نہ رہی اور باہر کے انبوہ میں کوئی کمی نظر نہ آتی تھی۔ انسانی سروں کا ایک سمندر تھا کہ ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ کسی ادبی جلسے کے سلسلے میں ایسا اجتماع اور عوام کا اشتیاق آج تک نہ کبھی دیکھا نہ سُنا۔ منتظمین نے حتیٰ الامکان ہجوم کو مشاعرہ گاہ میں داخل ہونے سے روکا۔ اس پر مقابلہ شروع ہوا اور آناً فاناً دروازوں کو توڑ کر وہ سیلاب اندر داخل ہو گیا۔

خدا جانے اس طوفانِ بدتمیزی میں منتظمین مشاعرہ ٹیگور اور نائیڈو کو کس طرح ہال میں لانے اور انھیں اپنی اپنی کرسیوں پر بٹھانے میں کامیاب ہو گئے۔ بہرحال دوسرے مدعو شعراء وہاں پہونچے تو منتظمین کا کوئی پتہ نہ تھا۔ اور اندر جانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ اب واپس جانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہی فیصلہ ہو رہا تھا کہ منتظمین میں سے کسی کو معلوم ہوا کہ جن شعراء کو مدعو کیا گیا تھا وہ واپس جا رہے ہیں۔ وہ لوگ دوڑے دوڑے آئے اور پولس کی امداد سے راستہ بنا کر شعراء کو ہال میں لے گئے۔ اس افراتفری میں پنڈت، ہری چند اختر اس قافلے سے بچھڑ گئے اور مشاعرہ میں شریک ہی نہ ہو سکے۔ منتظمین نے یہ ساری روئداد صدرِ جلسہ مسز نائیڈو سے بیان کی۔ آپ نے اہلِ پنجاب کو ان کی بد انتظامی کے لئے بہت سخت لفظوں میں جھاڑا اور جب انھیں بتایا گیا کہ پنڈت ہری چند اختر ہجوم کے عدم تعاون کے باعث قافلے سے بچھڑ گئے ہیں۔ تو آپ نے کہا میں پنڈت ہری چند اختر کے نام اور کلام سے اچھی طرح واقف ہوں اور مشاعرہ گاہ کے دروازے تک آکر ان کا مشاعرے میں شریک نہ ہونا اہلِ پنجاب کے لئے بہت باعثِ ندامت ہے۔ آپ نے منتظمین سے کہا کہ جیسے بھی ہو پنڈت ہری چند اختر کو تلاش کیا جائے تاکہ وہ اس مشاعرے میں شرکت کر سکیں لیکن نہ معلوم اختر صاحب کہاں چلے گئے تھے منتظمین انھیں تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

افسوس کہ جب ہندوستان کے دن پھرے اور اُردو ادب کو مسز سروجنی نائیڈو سے عملی طور پر فیض یاب ہونے کا وقت آیا تو موت کے ظالم ہاتھوں نے انھیں اپنے ملک اور اپنے ملک کے علم و ادب سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے چھین لیا اور وہ شمع جو اپنی ضیا سے دور دور تک فضا کو نورانی بنا رہی تھی ہمیشہ کیلئے بجھ گئی۔

ایس۔ بی۔ مکرجی

مترجمہ۔ ولی ہاشمی

چین کی گذشتہ تاریخ پر ایک نظر

اس وقت چین کا جو حشر ہو رہا ہے وہ دنیا کے زبردست المیوں میں سے ایک ہے۔

چین اپنی قدیم ترین تہذیب پر فخر کر سکتا ہے یہ ملک تیسری صدی قبل مسیح سے مسلسل ایک متحدہ سلطنت کی حیثیت چلا آتا ہے۔ یہاں ان گنت ایجادوں مثلاً کاغذ سازی، چھاپہ خانہ، قطب نما، اور بارود سازی وغیرہ نے جنم لیا۔ یہ ایجادیں خواہ تعمیری مقاصد کے لئے استعمال ہوئی ہوں یا تخریبی لیکن تاریخ انسانی پر ان کا زبردست اثر پڑا ہے۔

اٹھارویں صدی اور انیسویں صدی کے ابتدائی دور کے صنعتی انقلاب تک چین کی حکومت ہر لحاظ سے دنیا کی سب سے زیادہ مہذب اور طاقتور حکومت تھی۔

مغربی دنیا سے چین کے تجارتی تعلقات ایک ایسے زمانہ سے چلے آتے ہیں جو تاریخ عالم میں باعظمت سمجھا جاتا ہے۔ اطالوی سیّاح مارکوپولو جب پہلی مرتبہ چین آیا اُس وقت اِس ملک اور یورپ کے درمیان تجارتی تعلقات کا آغاز ہو چکا تھا۔

صنعتی انقلاب کے بعد جب مغربی اقتصادی سامراجیت کا دور شروع ہوا تو چین کی آسمانی سلطنت کا زوال شروع ہوا

مختلف مغربی قومیں اور جاپان کی ہوس ملک گیری نے اور خود یہاں کی خانہ جنگیوں کے باعث ۱۸۳۹ء سے ۱۹۴۵ء تک چین کی تاریخ میں مسلسل زوال تباہی اور انتشار پایا جاتا ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ چین کے المیہ کی ابتدا زیادہ تر بیرونی تشدد اور ساتھ ہی ساتھ اندرونِ ملک سماجی اور سیاسی خرابیوں سے شروع ہوتی ہے۔

پہلی اینگلو چائینیز جنگ (۴۲-۱۸۳۹ء) نے جو جنگِ افیون کہلاتی ہے دنیا پر پہلی مرتبہ ظاہر کر دیا کہ طاقتور چین در اصل کسقدر کمزور ہے۔ آخر کار شکست فاش کھا کر چین اپنے فاتح سے دبتی ہوئی صلح پر رضامند ہو گیا۔ اور اس نے اپنی پانچ بندرگاہوں کو بیرونی تجارت کے لئے کھولدیا۔ یہ بندرگاہیں کینٹن، اموئے ننگپو، فوچو اور شنگھائی ہیں۔ اور ہانگ کانگ ہمیشہ کے لئے انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔ نیز چین کے انگریز باشندوں کو حکومت چین کی نگرانی سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔ اور بعد میں یہ شرط چند دوسرے غیر ملکی باشندوں کے لئے مفید ثابت ہوئی ظاہر ہے کہ ان شرائط نے چین کی سلطنت کو پاش پاش کر دیا۔

۱۸۵۶ء میں کینٹن کے حکّام نے ایک چینی جہاز پر جو انگریزی پرچم لہرا رہا تھا چند چینی ٹھگ پکڑے۔ اور یہ جھگڑا ۶۰-۱۸۵۶ء کی دوسری اینگلو چائینیز جنگ پر ختم ہوا۔ اس جنگ میں فرانس نے بھی انگریزوں کا ساتھ دیا۔ چین کو پھر شکست ہوئی۔ اور ۱۸۶۰ء معاہدہ ٹینٹسن طے پایا۔ جس کی رو سے چند اور بندرگاہیں بیرونی تجارت کے لئے کھولدی گئیں۔

ان مسلسل پسپائیوں نے ملک کی اندرونی صورت حال پر بڑا اثر ڈالا اور ہنگ ہسیو چوان کی سرکردگی میں ٹیپنگ کی بغاوت شروع ہو گئی۔ یہ بغاوت ابتداءً مذہبی بنیاد پر شروع ہوئی لیکن آخر میں اس نے قومی رنگ اختیار کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چین میں ایک حکومت نے جنم لیا۔ جس میں ہنگ کو شہنشاہ مان لیا گیا اس نئی حکومت کا صدر مقام نانکنگ قرار دیا گیا۔ لیکن یہ سلطنت بھی بیرونی امداد سے ختم کر دی گئی۔

ٹیپنگ بغاوت کی وجہ سے ملک کا ایک بڑا حصّہ تباہ و برباد ہو چکا تھا۔ جان و مال کا شدید نقصان ہوا۔ اس بغاوت نے ملک کے کسان اور غریب طبقہ میں زمینداروں اور مالدار کاشتکاروں کے خلاف نفرت کا جذبہ بیدار کر دیا۔ اور اسطرح یہاں سے سرمایہ دار اور مزدور وغیرہ سرمایہ دار طبقہ کے درمیان کشمکش شروع ہو گئی۔

چین کے اس تاریک دور میں صرف ایک دھندلی سی روشنی

بھی دکھائی دے رہی تھی جو بعد میں ایک زبردست ثقافتی تحریک کا باعث ہوئی۔ چینی زبان میں غیر زبانوں کی مستند کتابیں ترجمہ کی جانے لگیں۔ چین کے نوجوانوں نے اس ادب کا خوب مطالعہ کیا اور بیرونی خیالات سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہوئے۔ جدید چین کے نام سے ایک اخبار بھی جاری ہوا سیاسی تحریک بھی شروع ہوئی اور ۱۹۱۱ء میں منچو شہنشاہیت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔

پہلی چینی جاپانی جنگ ۹۵-۱۸۹۴ء میں ہوئی جس میں چین نے شکست کھائی اور مشہور ناسیکی معاہدہ کے تحت یہ خونریزیاں ختم ہوئیں۔ چین کو کوریا کی خود مختاری تسلیم کرنی پڑی اور جزائر لیپکا ڈورس اور فارموسا جاپان کے حوالے کردئے گئے جاپان کو جزیرہ نمائے لیاؤ ٹنگ بھی مل گیا۔ لیکن جاپان کی اس کامیابی سے فرانس روس اور جرمنی چراغ پا ہوگئے۔ چنانچہ ان تینوں ممالک کے درمیان ایک سمجھوتہ طے پایا جس کی رو سے جاپان کو مجبور کیا گیا کہ وہ کچھ نقد معاوضہ لے کر لیاؤ ٹنگ سے دست بردار ہو جائے۔

بہرحال ان انقلابات اور معرکہ آرائیوں میں چین چت ہوگیا۔ برطانیہ، فرانس، روس اور جرمنی نے چین کو بانٹ لیا۔ جرمنی نے بندرگاہ سنگٹاؤ اور اس کے ساتھ خلیج کیاؤچاؤ کے علاقہ میں دوسو مربع میل کی زمین ننانوے سال کے قول پر حاصل کرلی۔ صوبہ شان تنگ کے ریل اور معدن کے کاروبار میں جرمنی کو ترجیح دی گئی۔ روس نے پورٹ آرتھر پچیس سال کے قول پر اور اس کے ساتھ لیاؤ ٹنگ علاقہ ۱۳۰۰ مربع میل زمین اور اہم ریلوے پر قبضہ کرلیا۔ برطانیہ نے چین کو مجبور کیا کہ جتنے عرصہ تک روس پورٹ آرتھر پر قابض رہے گا اسی عرصہ تک وائی ہائی وائی اپنے قبضہ میں دیدے۔ فرانس نے صوبہ کوان ٹنگ میں کوانگ چوان کی دوسو مربع میل زمین ننانوے سال کے لئے قول پر حاصل کرلی۔

اب امریکہ نے ڈورے ڈالنا شروع کئے۔ چنانچہ ستمبر ۱۸۹۹ء میں امریکہ کے وزیر داخلہ جان ہے نے امریکی کاروبار اور مالیات کی مناسب ضمانت حاصل کرلی۔ یہ چین میں کھلی تجارت کی ابتدا تھی۔

۱۸۹۸ء میں "اصلاحات کے سو دن" خاندان منچو کی تنظیم میں صرف ہوئے۔ اس وقت شہنشاہ کوانگ ہسو برسرِ حکومت تھا۔ کانگ یو وائی تحریک اصلاحات کی روحِ رواں تھا۔ اس تحریک نے اتنا زور پکڑا کہ شہنشاہ کوانگ ہسو اپنے ہی محل میں نظر بند سا ہوگیا۔ پھر بھی یہ تحریک خاطر خواہ کامیاب نہ ہوسکی۔

باکسر بغاوت (۱۸۹۹ء تا ۱۹۰۱ء) اسی تحریکِ اصلاحات کی ناکامی کا نتیجہ ہے۔ منچو شہنشاہیت نے اصلاحات قبول کرنے سے انکار کردیا اور اس سے نجات پانے کا واحد ذریعہ انقلاب ہی تھا۔ چنگ (یعنی خاندان منچو کے حکمرانوں کو ہٹادو، منگ کو واپس لاؤ، وغیرہ وغیرہ اس انقلاب کے نعرے تھے۔

لیکن چین کی ملکہ تشوہسی ہا منچوؤں کے خلاف جذبات کو مخالف بیرونی جذبات میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ عیسائی مشنری اور نئے عیسائی لوگ ہلاک کردے گئے۔ پیکنگ میں یورپ والوں کی املاک جلادی گئیں۔ لیکن بعد میں تو مغربیتوں اور جاپانیوں کی مشترکہ قوتوں سے یورپ والوں کو اگلا مقام مل گیا۔ اور جرمنی نے چینیوں کو یورپ والوں سے باعزت سلوک کرنے کا طریقہ سکھانے کے لئے ایک کمانڈر کو مقرر کیا۔ پے کنگ بھی واپس لے لیا گیا۔ بادشاہ کے گرمائی محل کو آگ لگادی گئی اور چین کو یورپ والوں کے آگے گھٹنے ٹیک دینا پڑے اور وہ یورپ والوں کو ہرجانہ کے طور پر ایک کثیر رقم دینے پر راضی ہوگیا نتیجہ یہ ہوا کہ دوبارہ امن قائم ہوگیا۔

لیکن شہنشاہیت کے خلاف مخالفت کی چنگاریاں جو مدت سے دبی ہوئی تھیں ۱۹۱۱ء میں ایک دم بھڑک اٹھیں منچو خاندان کا آخری شہنشاہ ہسو وان تنگ تخت سے اتار دیا گیا۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۱۲ء کو چین کی....... جمہوریت کا اعلان کردیا گیا۔

جدید چین کے معمار ڈاکٹر سن یات سین نے جو اس جمہوریہ کے پہلے صدر منتخب کئے گئے تھے۔ منچو کمانڈر یوان شی کائی کے حق میں اپنی صدارت سے استعفا دے دیا۔

۱۹۱۱ء کا چینی انقلاب جدید تاریخ کا ایک اہم ترین واقعہ ہے اور اس کا اثر ہندوستان کی قومی تحریک پر بھی کافی پڑا ہے۔ یہ انقلاب ایشیائی عوام کا پہلا عملی اقدام تھا۔ جس نے دوسرے ایشیائی ممالک کے لئے ایک مثال قائم کردی۔

۱۹۱۴ء میں پہلی جنگِ عظیم شروع ہوگئی۔ جس کے نتائج دُور رس ثابت ہوئے موقع سے فائدہ اٹھا کر جاپان نے جرمنی کے خلاف اعلان جنگ کر دیا اور چین کے جرمنی مقبوضہ شانٹنگ پر قبضہ کر لیا۔ اس پر بھی وہ خاموش نہ رہا بلکہ اس نے چین کے آگے اکیس نقاط پر مشتمل ایک مطالبہ پیش کیا اور ساتھ ہی ساتھ جنگ کی دھمکی بھی دی۔ ان مطالبات میں جاپان نے چین سے اقتصادی، ریلوے اور فوجی رعایتیں طلب کی تھیں۔ اگر یہ شرطیں پوری پوری منظور کر لی جاتیں تو چین جاپان کے ہاتھ میں ایک کھلونا ہو جاتا۔ چند ترمیموں کے ساتھ چین نے ان کو منظور کر لیا۔ لیکن ایسا کرنے سے جاپان کی گرفت چین پر مضبوط ہوگئی۔

اب اس کے بعد جاپان نے انگلستان فرانس روس اور اٹلی کے ساتھ خفیہ معاہدے کرنا شروع کئے۔ چنانچہ امن کانفرنس میں ان ممالک نے چین کے جرمنی علاقہ پر جاپانی قبضہ کو تسلیم کر لیا۔

لازنگ اشل معاہدہ ۱۹۱۷ء کی رو سے امریکہ نے چین میں جاپان کے خاص مفادات کو تسلیم کر لیا۔ میثاق ورسیلز ۱۹۱۹ء کے تحت جاپان کو چین میں بہت اہم مراعات ملیں حالانکہ چین نے احتجاج بھی کیا۔ چنانچہ امن کانفرنس میں چینی نمائندے نے اس معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ تمام ملک میں ناگوار جذبات پیدا ہو گئے۔ چین میں انگریز اور جاپانیوں کے درمیان تصادم ہوا جس سے چین کے حالات اور بھی خراب ہو گئے۔

معاہدۂ ورسیلز میں چین کے ساتھ جو نا انصافی کی گئی تھی اس کی جزوی تلافی کے طور پر واشنگٹن میں نو طاقتوں کا معاہدہ (۱۹۲۱ء) طے پایا جس کی رو سے چین کی شہنشاہیت کا تحفّظ کیا گیا۔

۱۹۲۳ء میں چین روس اتحاد کے ختم پر کومنٹانگ قومی پارٹی کے دروازے چین کی کمیونسٹ پارٹی (کونجنگ ٹان) کے لئے کھول دئے گئے۔

ڈاکٹر سن یات سین کی موت (مارچ ۱۹۲۵ء) چین کے لئے ایک عظیم ترین قومی سانحہ تھا۔ وہ حقیقت میں چینی قوم کے باپ تھے۔ انھوں نے اندازہ لگا لیا تھا کہ چین کا اصلی دشمن مغرب کی تجارتی سامراجیت ہے۔ اس دشمن کا مقابلہ کرنے کے لئے انھوں نے ایک تنظیم کی بناء ڈالی جس کا ایک مقصد بھی تھا۔ تنظیم کا نام کومنٹانگ اور اس کا مقصد "سان من چوآئی" یا عوام کے تین اصول، قومی اقتدار، جمہوریت اور عوام کی زندگی تھا۔

سن یاٹ سین ہی کا اثر چیانگ کائی شیک پر پڑا۔ ۱۹۲۶ء میں شمالی لڑاکا سردار کے خلاف مہم شروع ہوئی اور چینی روسی اتحاد ختم ہو گیا۔ کمیونسٹوں کو کومن تانگ سے نکال دیا گیا۔ اور نانکنگ میں ایک قومی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۳۱ء میں کمیونسٹوں نے وسط چین میں چینی سوویت جمہوریہ کے نام سے ایک علیحدہ حکومت قائم کر لی اور اس کے تحت ۱۹۳۲ء میں چین کا چھٹواں حصّہ آ گیا۔ ۳۰ تا ۱۹۳۴ء میں حکومت نانکنگ نے سرخ چینیوں کے خلاف مسلسل ۶ مہم بھیجیں نتیجہ یہ ہوا کہ کمیونسٹ وسط چین کو چھوڑ کر شمال میں ہٹ گئے اور انیان کو اپنا مستقر بنا لیا۔ چیانگ کائی شیک کا دَور چین کی تاریخ میں بہت ناکام اور تباہ کن دَور تھا۔ جاپان نے ۳۰ء میں منچوریا کو دبوچ لیا۔ چین نے لیگ آف نیشنس میں اپیل کی جس کا ایک رکن خود جاپان بھی تھا۔ لیگ نے ایک کمیشن مقرر کیا۔ یہ کمیشن منچوریا گیا اور ایک مناسب عرصہ میں اپنی رپورٹ پیش کر دی اور معاملہ یہاں ختم ہو گیا۔ جاپان نے لیگ سے اپنی علیحدگی کا اعلان کر دیا اور چین پر حسب سابق مظالم شروع کر دئے۔ نانکنگ حکومت نے جاپانی سامراجیت کے بڑھتے ہوئے طوفان کو روکنے کے لئے تدابیر اختیار نہ کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ۲۷ تا ۳۱ء کے دوران میں چین کو ۲۰ فی صدی ملک، ۴۰ فی صدی ریلوے ۸۵ فی صدی غیر مزدور زمینوں ۸۰ فیصدی لوہے کی کانوں، ۸۷ فی صدی جنگلوں اور ۶۰ فی صدی بیرونی تجارت سے ہاتھ دھونا پڑا۔

اس زمانہ میں چیانگ کائی شیک نے ایک سے زیادہ مرتبہ اعلان کیا کہ چین ابھی ایک کمزور ملک ہے اور وہ جنگ میں الجھنا نہیں چاہتا۔ چنانچہ چیانگ نے اپنے دشمن سے سمجھوتہ کرنے کی ممکنہ کوشش کی لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا۔

۱۹۳۶ء میں کمیونسٹ کومن تانگ جنگ شروع ہوئی اس جنگ میں منچوریائی فوجوں نے چیانگ کائی شک کا اغواء کر لیا۔ اور ان کی رہائی کے لئے حسب ذیل شرائط پیش کیں۔

(۱) جاپان کے خلاف اعلان جنگ

(۲) خانہ جنگی کا سدّباب

(۳) جاپان مخالف قیدیوں کی رہائی۔ اور
(۴) عوام کے شہری حقوق کو تسلیم کر لینا۔
۱۹۳۷ء میں جاپان نے بغیر اعلان کے چین کے خلاف جنگ شروع کر دی اس جنگ میں کمیونسٹ اور کومن تانگ نے مل کر جاپان کا مقابلہ کیا۔ یہ جنگ ۱۹۴۵ء میں ختم ہی ہوئی تھی کہ کمیونسٹ اور کومن تانگ آپس میں لڑ پڑے اور چین دو ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ چیانگ کائی شیک نے کمیونسٹوں پر الزام لگایا اور کمیونسٹوں نے چین کے ان سارے مصائب کا ذمہ دار چیانگ کو ٹھیرایا۔

اس جنگ کا نتیجہ آپ پر روز روشن کی طرح ظاہر ہے۔

(یونائیٹڈ ایشیا)

باقر رضوی

دُنیا میں جنّت

آج جبکہ دنیا بھر میں عام انسانوں کی بنیادی ضرورتوں تک کی تسکین ممکن نہیں اور افراطِ زر کے باوجود متوازن غذا، معقول لباس اور صحت بخش رہائشی گنجائش کا فقدان ہے۔ مادّی اشیاء کے ساتھ ساتھ روحانی عناصر جن سے انسانیت کا پودا پروان چڑھتا ہے ناپید ہو گئے ہیں۔ محبت، مروّت اور اخوت کو گلشنِ ہستی سے سبزۂ بیگانہ کی طرح اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہے اور جنگ جن اقدار کو تباہ نہ کر سکی تھی وہ "ایٹم بم" کی زد پر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے دنیوی تہذیب کی عظیم الشان عمارت تاش کے پتوں کے گھروندے کی طرح چشم زدن میں زمین پر آ رہے گی۔ آج جبکہ جنسی خواہشات کے فطری اور غیر فطری تسکین کے طریقوں کی بہتات کے باوجود جوان مرد اور عورتیں ناقابلِ علاج جنسی بیماریوں اور پیچیدگیوں میں مبتلا نظر آتے ہیں۔ ہم آپ کو ایک ایسی جنتِ ارضی میں لئے چلتے ہیں جہاں سکے کا رواج نہ ہونے کے باوجود کھانے پینے رہنے کی تمام سہولتیں ہیں۔ جہاں انسان محبت اور ہمدردی کی چھاؤں تلے آرام کرتے ہیں۔ جہاں کی سرزمین بغض و حسد کے کانٹوں سے پاک ہے جہاں کی وادیاں نام نہاد تہذیب سے ملوّث نہیں، جہاں آج بھی آدم و حوّا باغِ عدن میں ایک ابدی مسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ جہاں کوئی شجر ممنوعہ نہیں۔ جہاں اخلاق کو تجارت کے ترازو میں نہیں تولتے، جہاں عزتِ نفس چند نوالوں کے لئے نہیں بیچی جاتی، جہاں ضمیر و جسم چند چمکتے سکوں کے عوض فروخت نہیں کئے جاتے۔

یہ ہے قبیلہ ٹوڈا کی مثالی دُنیا، اس قبیلہ کا مسکن جنوبی ہند کی روکشِ جنت اور رشکِ ارم... نیل گری کی پہاڑیاں ہیں، صبح سے شام تک کولہو کے بیل کی طرح کام کرنے والے افراد اپنے دل کے پھپھولے پھوڑنے کے لئے اس قبیلہ کو دُنیا کا کاہل ترین قبیلہ گرداننے ہیں۔ لیکن اصل میں یہ دنیا کا سب سے عقل مند قبیلہ ہے۔ کیونکہ اس قبیلہ کے افراد زندگی کے اس اہم ترین فلسفۂ حیات سے واقف ہیں۔ جہاں کچھ کئے بغیر بھی انسان مشغول رہتا ہے اور جہاں خون و پسینہ ایک کئے بغیر نخلِ رزق کی آبیاری اور بار آوری ہوتی ہے، اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ لوگ ہر طرح سے مطمئن ہیں۔ یہ لوگ کاشتکاری نہیں کرتے مگر "مالکانِ ارض" کہلاتے ہیں۔ اور آزادی اور بے فکری کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

"بودی گھر" قبیلہ کے افراد پر محصول لگا کر یہ اپنی روزی مہیا کرتے ہیں۔ بودی گھر والے ان لوگوں کو مقدس مانتے ہیں اور ان کی روحانی عظمت کے قائل ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے پاس سب سے بڑا مادّی سرمایہ "بھینسوں کا گلہ" ہے۔

قابلِ توجہ

خدوخال، چہرہ مہرہ اور عادات و اخلاق کے لحاظ سے ٹوڈا قبیلہ قابلِ توجہ ہے، یہ لوگ قوی الجثہ، طویل القامت اور چوڑے چکلے ہوتے ہیں۔ جرأت اور دلیری ان کی فطرت کا جزوِ لاینفک ہے۔ فطری طور پر یہ لوگ سیر و شکار کے دلدادہ ہیں، ان کا لباس ایک چادر کے سوا کچھ بھی نہیں، یہ چادریں عموماً موٹے کپڑے کی ہوتی ہیں۔ اور ان کے ایک کنارے پر دھاریاں، حاشیہ اور نقش و نگار ہوتے ہیں۔

سالمیت

ٹوڈا کون ہیں۔ اور کہاں سے آئے — ؟ یہ ایک بحث طلب مسئلہ ہے۔ اس پر بہت سی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں اور کی جا سکتی ہیں، ہم فی الحال اس ادھیڑبن میں نہ پڑیں گے — یہاں صرف یہ جان لینا کافی ہے کہ یہ قبیلہ ایک عرصہ سے نیل گری کی پہاڑیوں اور وادیوں میں اٹکی منڈ کے پاس رہتا ہے۔ وقت نے اب تک ان کے ہزاروں برس پرانے رسم و رواج پر اپنی مہریں ثبت نہیں کی ہیں۔ ہزاروں طوفان اٹھے اور ساحلوں سے ٹکرا کر ٹھنڈے پڑ گئے۔ مگر یہ چٹان کی طرح اپنی جگہ پر اٹل ہیں، ملک اور

قومیں ترقی اور تنزل کے مد و جزر میں اُبھرتی اور ڈوبتی رہیں، مگر اس قبیلہ کی یکسانیت میں کوئی فرق نہیں آیا، اس کی سالمیت اور وحدت اب بھی باقی ہے - یہ ایک ناقابلِ تقسیم اکائی ہے -

شاعری

اس قبیلہ کے افراد پہاڑیوں کی فرحت بخش، خوشگوار اور ولولہ خیز و جنوں انگیز ہواؤں میں چین کی بنسی بجاتے ہیں طلوع و غروبِ آفتاب شفق اور قوس و قزح کے مناظر، نکھری ہوئی چاندنی، بکھرے ہوئے تارے، اُمنڈتے ہوئے بادل، جھومتے ہوئے درخت اور لہلہاتے ہوئے کھیت ان کے دل میں جذبات کا طوفان اٹھاتے ہیں۔ وہ انھیں اپنے گیتوں اور نغموں کے سانچے میں ڈھال لیتے ہیں، ہر تقریب میں ناچ اور گاکر یہ لوگ اپنے غیر مجلّی احساسات کی ترجمانی کرتے ہیں، بچّوں کو بہلانے اور سلانے کے لئے انھوں نے لوریاں بنائی ہیں۔ دوشیزاؤ کی صحت اور جوانی اور حسن سے جب انکے دل کے تار لرز اٹھتے ہیں تو یہ عاشقانہ اشعار موزوں کرتے ہیں اور جب کسی عزیز کی موت سے ان پر حزن و ملال کے بادل چھا جاتے ہیں تو ان کے شعروں میں درد و غم کا رنگ نکھر آتا ہے، یہ دیوتاؤں کی تعریف بھی کرتے ہیں - غرض ادب کی زبان میں یہ کہئے کہ ان کے یہاں گیت، لوری، غزل، مرثیہ، اور قصیدہ سب کچھ موجود ہے مگر عشق و عاشقی کی داستانیں انکی شاعری کی جان ہیں۔

جنسی تعلقات

قبیلہ ٹوڈا کے افراد کو اپنے جنسی جذبات کی تسکین میں جتنی آزادی ہے اتنی شاید ہی دنیا میں کسی اور کو ہو، عام طور پر بغض و حسد نفرت اور انتقام کے جو جذبات جنسی تعلقات کی بدولت معرض وجود میں آتے ہیں ان کا یہاں نام و نشان نہیں۔

ازدواجی زندگی ان کے یہاں ایک مستقل اور اہم ادارے کی حیثیت رکھتی ہے۔ جب قبیلہ کا کوئی فرد سن بلوغ کو پہونچتا ہے تو اسے اور اس کے گھر والوں کو شادی کی فکر لاحق ہوتی ہے۔ وہ پہلے اپنے قبیلہ کی ایک دوشیزہ کو منتخب کرتا ہے۔ پھر رفتہ رفتہ اس سے تعلقات بڑھاتا ہے۔ اسے ہم بستری پر راضی کر کے حجلۂ عروسی میں لے جاتا ہے اور اس کے ساتھ شب باشی کرتا ہے۔ شب وصل

حجلۂ عروسی کے باہر لڑکی کی ماں نگرانی کرتی ہے تاکہ کوئی دوست یا دشمن اس مقدّس فعل میں مداخلت نہ کرنے پائے۔

صبح کو عروسِ نو کی طرح جب آفتاب سرخ سرخ پہاڑیو کی اوٹ سے نیچی نظریں کئے ہوئے اپنا سر اُٹھاتا ہے اور وادیوں میں رات کی کلیاں پھول بن جاتی ہیں تو آفتاب و ماہتاب کی طرح دو ہنستے ہوئے چہرے حجلۂ عروسی سے باہر نکلتے ہیں۔ لڑکی اپنی سہیلیوں اور ماں کے سامنے فطری نسائی شرم و حیا کے ساتھ شب باشی اور وصلت کے تمام واقعات من و عن بیان کرتی ہے اور آخر میں سر کی خفی یا متوازی جنبش سے مباشرت کا اثبات یا نفی میں اقرار یا انکار کرتی ہے۔

لڑکی کے اس اقرار کے بعد لڑکا خوشی سے کھل اٹھتا ہے اور لڑکی کے گلے میں ہاتھی دانت یا پھولوں کا ایک ہار پہنا کر شادی کے عہد نامہ کی تکمیل کر دیتا ہے۔ اس کے بعد شادی کی رسمیں منائی جاتی ہیں اور قبیلہ والوں کو دعوت دی جاتی ہے۔

شادی کے بعد ایک بھائی کی بیوی اس کے تمام غیر کنوآرے بھائیوں کے تصرّف میں آتی ہے یعنی اس دروپدی پر سب پانڈوں کا برابر کا حق ہوتا ہے۔

اگر کسی شخص کی بیوی مرجائے تو وہ قبیلہ کے کسی دوسرے شخص کی بیوی سے اپنی جنسی خواہشات پوری کر سکتا ہے اور چاہے تو اسے گھر میں بھی ڈال سکتا ہے۔ ہاں اس موخرالذکر صورت میں اس نئے شوہر کو پرانے شوہر سے بات چیت کرنا پڑتی ہے۔ معاملہ چند گائیں دے کر طے ہو جاتا ہے۔ پہلا شوہر معترض ہو سکتا ہے اگر یہ روایات اور وضع داری کے خلاف ہے کیونکہ عورت خود ہی خوشی خوشی دوسرے مرد کے ساتھ زندگی بسر کرنے پر راضی ہوئی ہے۔ اب اس غم نصیب شوہر کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں ہوتا کہ وہ کہیں اور ڈورے ڈالے۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہتا ہے مگر کبھی کشت و خون کی نوبت نہیں آتی،

شادی کے بعد بھی محبت اور عشق کے قصرِ زریں کے آہنی دروازے بند نہیں کئے جاتے۔ ہر آدمی کسی بھی عورت کو اپنی معشوقہ بنا سکتا ہے اور ہر عورت کسی بھی مرد کو اپنا عاشق۔

لیکن یہ مسرت آمیز چپقلش کسی ایسی مادی شکل میں ظہور

پذیر نہیں ہوتی جس سے قبیلہ کی سالمیت میں فرق آئے، قبیلہ میں عشق کے سدابہار پھول ہمیشہ کھلے رہتے ہیں اور محبت کا پودا کبھی وقفِ خزاں نہیں ہوتا، زندگی کی بہار و خزاں یونہی گزرتی رہتی ہے۔

جانوروں کا احترام

یہ سب پڑھکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو عشق و عاشقی سے دم مارنے کی مہلت نہ ملتی ہوگی لیکن شاید آپ کو یہ سن کر تعجب ہوگا کہ ٹوڈا قبیلہ کی زندگی کا مرکز اور محور گائیں اور بھینسیں ہیں عشق و معاشقہ نہیں۔

جانوروں اور ان کی متعلقہ اشیاء کا یہ حد درجہ احترام کرتے ہیں۔ جانوروں کا تھان ان کے لئے عبادت گاہ سے کم نہیں۔ اس کے علاوہ ان کا کوئی عبادت خانہ نہیں گائے اور بھینس ان کے لئے انسان سے زیادہ مقدس اور متبرک ہیں انسان ان جانوروں کے پیدائشی خادم ہیں۔ ٹوڈا کا عبادتی جملہ یہ ہے۔

" خدا ہماری گائے بھینسوں کو اپنے حفظ وامان میں رکھے"

مذہبی رہنما

قبیلہ ٹوڈا میں سماجی اور مذہبی رہنماؤں کے پانچ طبقہ ہیں سب سے اونچا طبقہ "پالال" کا ہے۔ یہ لوگ گائے بھینس کے گلّے پالتے ہیں۔ اس طبقہ کا بڑا اثر ہے۔ ٹوڈا کا خیال ہے کہ خدا "پالال" طبقہ میں رہتا ہے اور انھیں مشورہ دیتا ہے۔ دودھ بیچنا یہ لوگ مہا پاپ خیال کرتے ہیں۔ قبیلہ کا تمام دودھ پالال کا فطری حق ہے۔ پالال کو بودی گھر والے سوغات بھی دیتے ہیں۔ بودی گھران سے ڈرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ لوگ فنِ جادوگری سے بھی واقف ہیں۔

تعزیتی رسوم

جب کوئی آدمی مرجاتا ہے تو عجیب وغریب رسمیں منائی جاتی ہیں۔ عام لوگوں کو زندگی بھر دودھ نہیں ملتا۔ مگر مرتے وقت پلایا جاتا ہے۔ مُردے کو گھر کے تمام زیورات پہناکر کورے کپڑے میں کفناتے ہیں۔ کفن میں جیبیں بناتے ہیں اور ان جیبوں میں سفرِ آخرت کے لئے غلّہ، شکر اور نمک کی شکل میں زادِ راہ بھر دیتے ہیں۔ موت پر گائے اور بھینس کی قربانی کی جاتی ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ دوسری دنیا میں مرنے والے کو دودھ کی دقّت نہ ہو۔ ان لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ مکرتی چوٹی سے انسان اور جانوروں کی روحیں ایک ساتھ جنّت میں جست لگاتی ہیں۔

عجیب راز

ٹوڈا کی زندگی کا انحصار، دودھ، دہی، مکھن، گھی اور اجناس پر ہے، ان کی مجموعی تعداد مرد و زن ملاکر چھ سو سے زیادہ نہ ہوگی۔ یہ عجیب بات ہے کہ صدیاں بیت جانے کے باوجود ان کی مجموعی تعداد میں کوئی خاص تفاوت نہیں ہوا ہے۔ اس قبیلہ کے افراد کبھی اتنے نہیں بڑھے کہ ضروریات زندگی کی کمی محسوس ہو اور کبھی اتنے کم نہیں ہوئے کہ ان کے نیست و نابود ہو جانے کا خدشہ لاحق ہو جائے۔

شاید انھیں قدرتی وسائل کے حدود میں رہ کر زندگی قائم رکھنے کا فطری اور ابدی راز معلوم ہوگیا ہے۔ یہ لوگ فطرتاً خوش طبع ہوتے ہیں۔ انھوں نے کوئی ترقی نہیں کی لیکن اگر صحیح ترقی یہی ہے کہ انسان زیادہ سے زیادہ مسرت سے ہم کنار ہو سکے تو ٹوڈا دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ قبیلہ ہے۔

اگر گنجائشیں ہوتیں نہ میرے رازِ خلقت میں
کہاں انگڑائیاں لیتی تمہاری عالمِ ایجادی!

ساغر

کے آصف پیش کرتے ہیں
ہلچل
ستارے
نرگس۔ ستارہ۔ دلیپ کمار
جیون۔ کے، این، سنگھ۔ اور
یعقوب
ڈائرکشن:۔
ایس، کے، اوجھا
سکرین پلے:۔ حسرت
میوزک:۔ سجّاد
نیشنل تھیٹرس مووی ٹون پکچرز۔ پروڈیوسر الیسٹرن اسٹڈیوز ۷۵۔۷۷، لوگر روڈ ورلی بمبئی
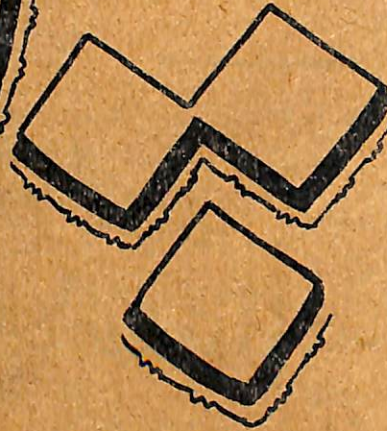
ہزار داستان
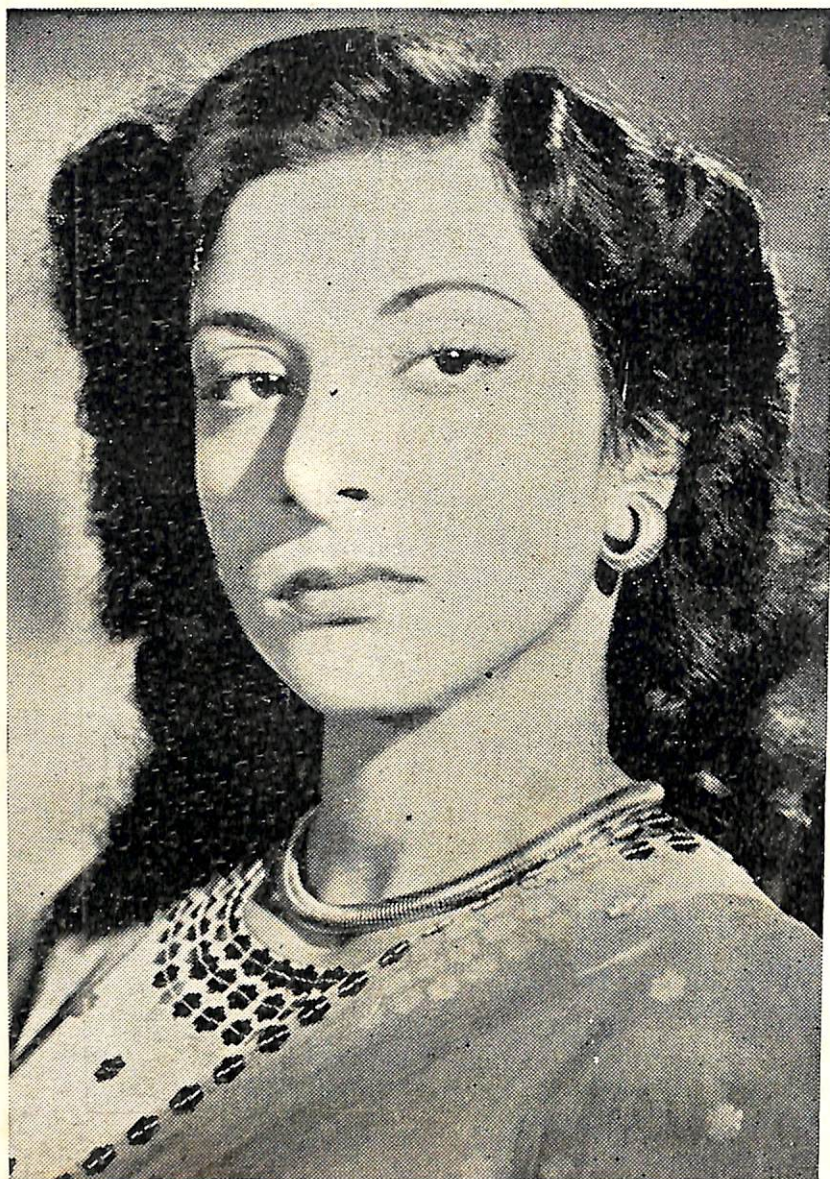
NARGIS IN "ANDAZ"
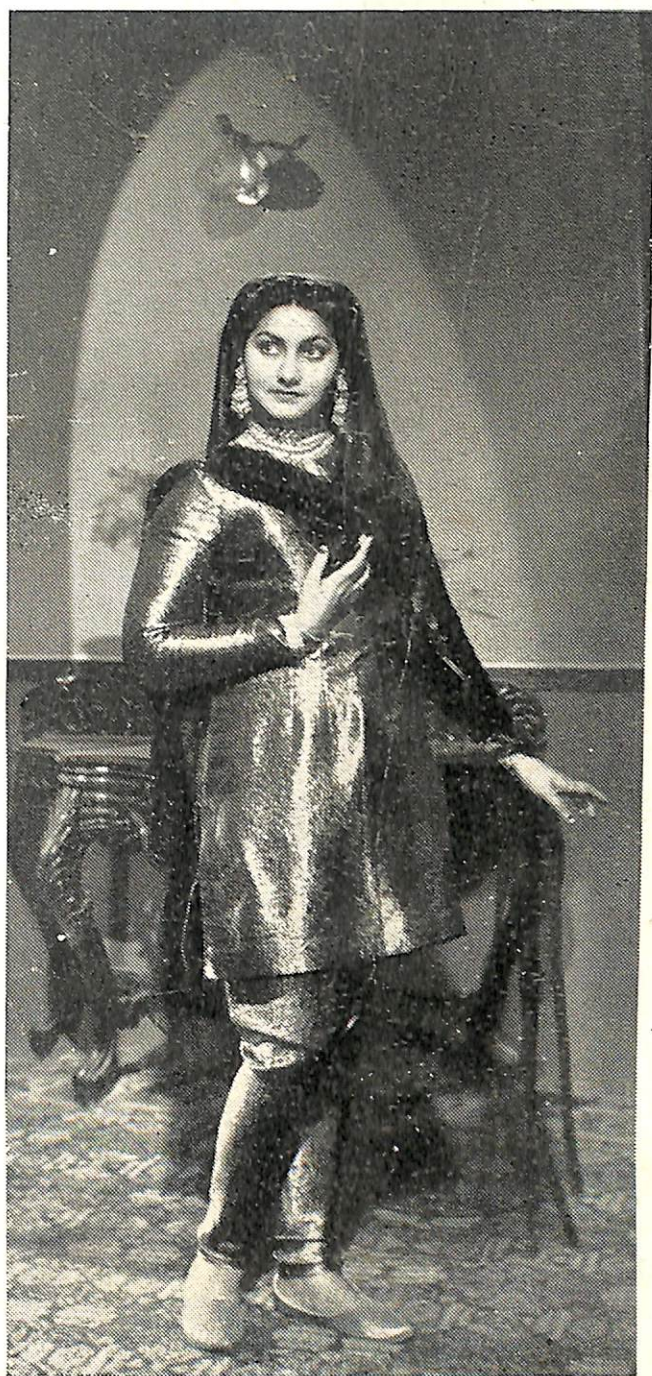
MEENA IN "AK THEE LARKE"

صالحہ عابد حسین

ستی

گاڑی تیزی سے چلی جا رہی تھی۔ میں کھڑکی کے شیشے سے سر ٹکا کر شاید اونگھ گئی تھی کہ ایک جھٹکے نے میرا سر شیشے سے ٹکرا دیا۔ گاڑی ٹھیر گئی.....

"فرید آباد.... فرید آباد.... مہدی فرید آباد کی....."

میرے دماغ کو اس سے بھی زیادہ زور کا دھچکا پہنچا..... فرید آباد؟..... فرید آباد؟ اس کا وطن؟ اس حسین نوجوان دوشیزہ کا وطن!! اس نامراد جوان مرگ کا وطن..... جس نے آگ کے شعلوں میں مسکراتے ہوئے جان دے دی؟

گورا رنگ جس میں سیب کی سی سرخی جھلکتی ہوئی۔ بڑی بڑی مخمور آنکھیں جن میں سے شوخی اور ذہانت جھانکتی ہوئی۔ ہنستی پیشانی، مسکراتا چہرہ، چھریرا بدن، مناسب اعضا، چال میں پھرتی کام میں صفائی۔ زندگی، تندرستی اور خوش دلی کی بولتی ہوئی تصویر... محنت اور سلیقے کی جیتی جاگتی مورت۔

فراش خانے میں شادی کی محفل جمی ہے.... ہر طرف چہل پہل اور ہنگامہ برپا ہے۔ کہیں دلہنیں اپنے زرق برق لباسوں میں جگمگا رہی ہیں، کہیں نوجوان لڑکیاں زندگی و مسرت کے نغمے بکھیر رہی ہیں، کہیں بڑی بوڑھیاں بیٹھی ماضی کی یادوں میں غرق مستقبل کے اندیشوں سے لرزاں اور حال کی حالت پر نوحہ خواں ہیں۔ ان کی توجہ کا مرکز زیادہ تر نوجوان کنواری لڑکیاں ہیں جنھیں وہ گھور رہی ہیں، رائے زنی کر رہی ہیں۔ اعتراض بھی ہیں۔ تعریفیں بھی.... اور اپنے اپنے بیٹوں کے لئے نظروں نظروں میں دلہن کا انتخاب بھی۔

وہ سامنے سے منہ چھپائے نکل کر کمرے میں گھس جاتی ہے ایک بیوی جو دیر سے اسے للچائی نظروں سے دیکھ رہی تھیں دوسری سے پوچھتی ہیں "اے ہے یہ ایسی پیاری صورت کی لڑکی کون ہے؟"

"تم نے اسے نہیں دیکھا کیا؟ میری بہن کی بچی ہے۔"

"اے بڑے کام کی بچی ہے.... جب سے آئی ہوں اسے کام ہی کرتے دیکھ رہی ہوں۔ کل کی طرح پھر رہی ہے.... اور ایک یہ لڑکیاں ہیں۔ اوری نگوڑی، پارس ناتھ.... بدتمیز.... بیہودہ بس ٹھی ٹھی، ٹھٹی ٹھی!" بڑی بی نے ایک لڑکیوں کے جھنڈ کو بری بری نظروں سے گھورتے ہوئے کہا، جو آپس میں ایک دوسرے سے چہلیں کر رہی تھیں۔

"بہن یہ بچاری تو دس برس کی عمر سے گھر کو سنبھالے ہے۔ میری بہن کو تو تم جانو ہو۔ سال پیچھے ایک بچہ ہوئے ہے..... اور نو مہینے پلنگ پر پڑے گزریں ہیں۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا ہے۔ سارے گھر کا کام بھائیوں کی خدمت، ننھے بچوں کی دیکھ بھال سب اسی کے سپرد ہے۔"

"اتنی عمر میں سارے گھر کا کام سنبھال رکھا ہے؟ ماشاءاللہ ماشاءاللہ"

پھر گاؤں کا رہنا۔ بھینس، گائے... دودھ گھی، سب کام۔ اور کھیتی باڑی ہے، اناج، بھوسہ، غلہ سب کا رکھنا سینتنا اسی کے ہاتھ میں ہے۔"

"اے اللہ اس کا نصیبہ اچھا کرے..... بہن اس بچی کو تو تم مجھے دلوا دو۔"

"بوا اس کی تو منگنی ہو چکی اپنے پھوپی زاد بھائی سے۔"

"اے ہے۔ یہ تو برا ہوا۔"

دوسری بیوی نے اس کی ماں سے جو ابھی آکر بیٹھی تھی پوچھا "بہن اپنی لڑکی کا بیاہ کب کرو گی؟"

"میرا بس چلے تو ابھی چار چھ برس بھی نہ کروں۔ ابھی عمر ہی کیا ہے اس کی۔ پر بادا کو بڑا ارمان ہے کہ لاڈو کا جلدی سے بیاہ رچا دیں" ماں نے بیٹی کی چڑھتی ہوئی جوانی کو ضرور رشک کے ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا — یہ اُن کی اپنی جوانی ہی نے تو یہ روپ دھار لیا ہے —

"بہو تو کم سِن ہی اچھی لگتی ہے۔ منہ پر کچا پن ہوتا ہے۔ نور برستا ہے۔ اے، پچیس تیس برس کی ڈھونگ کی ڈھونگ چہرے پر ٹھیکرے پھوٹتے ہوئے، کس کام کی ایسی بہو ـــ"

"اب اگلے سال اس کا دولہا بی۔ اے کر لے گا تو بیاہ کر دیں گے خیر سے۔۔ پر سچ پوچھو تو میں تو اس کے بیاہ کے خیال ہی سے پاگل ہونے لگوں ہوں۔ تم ہی کہو یہ بیاہ گئی تو میں کیا کروں گی باجی؟"

"اللہ مالک ہے ..... تم تو کرو بچی کا بیاہ"

اور وہ اندر کمرے میں ان سب کی باتیں سنتی رہی۔ ـــ کبھی مسکرا پڑتی، کبھی ماتھے پر بل پڑ جاتے ... اور آخر میں بیاہ کا ذکر سُن کر اُس کا چہرہ گلابی ہو گیا۔ اور جب باہر آئی تو چال میں لچک اور ہونٹوں پر خفیف سی دلآویز مُسکراہٹ تھی۔

ایک سہیلی نے چھیڑا "یہ منہ کیوں لال ہو رہا ہے .... ؟"

"خواہ مخواہ"

"کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے؟"

"میں بتاؤں .... ابھی امّاں اور خالہ دلّی کی بیویوں سے اس کے بیاہ کی باتیں کر رہی تھیں"

"اچھا یہ بات ہے۔ جبھی دل کا کنول کھِل اُٹھا ہے"

"بھئی یہ تمہاری دلّی کی بیویاں بھی خوب ہیں۔ بات پوچھیں بات کی جڑ پوچھیں ....."

"اجی حضرت ہماری دلّی تو بُری ہے۔ بہت بُری۔ پھر جانے کیوں لوگ بھاگ کر آیا کرتے ہیں یہاں"

"بُرا کون کہتا ہے تمہاری دلّی کو .... دلی میں تو میری جان اٹکی ہوئی ہے۔ اللہ کرے بھائی جان یہیں نوکر ہو جائیں تو پھر یہیں رہوں گی۔"

"اور یہ نہ ہو تو دولہا سے شرط کر لینا کہ دلّی میں نوکری کرے"

"ہنہ ـــ شرطیں کرنا تم"

"ہاں ہاں وہ تو بغیر کسی شرط کے تیرا بن داموں کا غلام ہو گا ـــ"

"بھئی ایمان کی بات ہے اس کا دولہا ہے بڑا خوش نصیب"

"ہٹو بھی" اور پھر اس کے منہ پر لالی بکھر گئی ..... دلّی میں تو وہ نوکر ہوں گے ہی ـــ اہا وہ مزے سے دلّی میں رہے گی ـــ اور سب عزیزوں اور سہیلیوں سے ملنے جایا کرے گی۔ مہینے میں دو تین مرتبہ سینما ضرور دیکھیں گے۔ اور پھر ـــ اور پھر لال قلعہ، ہمایوں کا مقبرہ، قطب صاحب کی لاٹ۔ اوکھلا ـــ سب جگہ کی سیر کرنے جایا کریں گے ـــ وہ ساتھ ہوں گے ـــ کتنے کتنے۔ پیارے ہیں وہ ـــ وہ من ہی من میں خیالی جنّت بسانے لگی ـــ

دلی میں بھائی نوکر ہو گیا۔ پر اُس کی یہاں آکر رہنے کی آرزو پوری نہ ہوتی۔ اماں میاں کو کیسے چھوڑیں؟ بڑھاپے میں بھی یہ محبت؟ اور پھر کنواری لڑکی جوان بھائی کے پاس جا کر کیسے رہ سکتی ہے؟ اونھ یہ سب بہانے ہیں۔ جانتی ہے چلی جاؤں تو یہ دن رات خدمت کون کرے گا ان کی ـــ پر آخر ـــ آخر ـــ ایک دن تو جانا ہی ہو گا۔

پر خیر کسی نہ کسی طرح اس کی آرزو پوری ہو ہی گئی۔ اور دلّی آنا ہو ہی گیا۔

میوات میں فساد ہوا تو ہو، میووں اور جاٹوں نے ایک دوسرے کا گلا کاٹا تو کاٹا پر ایک فائدہ ہوا؟ ابّا ڈر گئے اور سب بچوں اور بیوی کو لے کر دلّی میں بیٹے کے پاس آ گئے۔ کہیں بھی جھگڑا رگڑا ہو پر دلّی تو ہر طرح سے محفوظ ہے۔ دلّی تو دل ہے ہندوستان کا ـــ بھلا دل ہی کا فعل بگڑ جائے تو سارے جسم کا نظام نہ بگڑ جائے گا ـــ دل کی حالت درست رکھنا تو معالج کا پہلا کام ہے ـــ دلّی میں تو فساد ہو ہی نہیں سکتا۔

کیسے خوش عقیدہ اور سادہ دل ہوتے ہیں لوگ ...

انھیں کی شان میں تو غالب کہہ گئے ہیں ؎

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انھیں کچھ نہ کہو

اور اسے اپنے ابّا کی ان باتوں پر پورا پورا یقین تھا ـــ اور وہ بڑی بے فکری اور اطمینان سے دلّی میں رہنے لگی۔

اور پھر ۱۵ر اگست آئی ـــ آزادی کی روشن اور تابناک صبح ـــ کتنی مشکل اور کتنی کوششوں کے بعد اُسے جشنِ آزادی دیکھنا نصیب ہوا۔ پہلے کیسے کیسے روڑے اٹکائے گئے۔ امّاں اور خالہ نے کہا "شریف گھروں کی کنواری بیٹیاں میلے ٹھیلے میں نہیں جایا کرتیں" ابّا چچا نے کہا "اجی ہم اس عمر میں کہاں اتنے بڑے ہجوم میں جا کر اپنے کو کچلوائیں گے" بھائی بولے "تو یہ جی یہ بلا کون سر لے اپنے۔ ہم خود جشنِ آزادی دیکھیں گے، سیر کریں گے یا ان لڑکیوں کو گھسیٹے پھریں گے"

ہائے کیسے خود غرض اور مطلبی ہوتے ہیں یہ بھائی بھی - جب سوئٹر اور موزے بنوانے ہوں، رومالوں میں بیل کڑھانا ہو، دوستوں کو پارٹی دینی ہو یا سینما کے لئے روپوں کی ضرورت ہو تو کیسی محبت پھٹ پڑتی ہے بہنوں پر، لاڈو، بھنّو، اچھی بہن، پیاری بٹیا...... کیسے کیسے لاڈ، کیسی کیسی خوشامدیں ہوتی ہیں - اور اب جو ذرا ہم نے کہا کہ جشن دکھاؤ تو کیسی طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیں ــــ !!

پر آخر بھائیوں کو ہار ماننی ہی پڑی - بہنیں روٹھ گئیں - آئندہ کوئی کام نہ کرنے کا عہد کیا - پھر تانے تشنوں پر نوبت آئی اور آخر میں لالچ دئے گئے - سوئٹروں اور موزوں، رومالوں اور کمربندوں اور پکوانوں کے لالچ نے ان کے پتّھر دل موم کر دئے -

وہ بھی آخر انسان تھے اور مرد اور نوجوان ...... پھر، پھر جب کہ ان بہنوں ہی میں بعض کی (چچا زاد، پھوپی زاد، خالہ زاد وغیرہ) پسندیدہ اور منتخب شدہ لڑکی بھی موجود تھی ... جانے اس گڑبڑ میں کسی جگہ درد دل کہنے ہی کا موقع مل جائے .... اور نہیں تو کم سے کم خوشی تو پوری ہو جائے گی ان کی، چنانچہ سارے گنتے بھر کے بھائیوں نے لڑ جھگڑ کر سب بہنوں کو جشن آزادی دکھانے کی اجازت دلوا ہی لی - تبرک کے طور پر ایک بڑی بی تو ضرور ان کے ساتھ تھیں، باقی ساری پارٹی نوجوان لڑکے لڑکیوں کی تھی - اوہ - کتنے مزے آئے تھے اس دن بھی ــــ اور سب لڑکے لڑکیاں ہنسی ٹھٹے ــــ چھیڑ چھاڑ اور چہلوں میں منہمک تھے - پر وہ جشن آزادی کے شاندار منظر اور نیتاؤں کی جادو بھری تقریروں سے مسحور سی ہو کر رہ گئی تھی - افوہ کتنا پُر اثر اور دلکش منظر تھا وہ بھی - جیسے وہ اس کے دل پر نقش ہو گیا تھا -

---

پھر جانے کیسے ــــ کچھ ہی دن کے بعد دلّی بھر میں خوف و ہراس پھیل گیا - افواہوں کا بازار گرم تھا، ایک سے ایک خوفناک خبر دل و دماغ کی تواضع کو حاضر ــــ آج یہاں اتنے مسلمان مارے گئے - کل وہاں اتنے ہندوؤں کا قتل ہوا - آج یہ ریل لٹی - کل اس اسٹیشن پر خون ہی خون تھا ــــ آج یہ ــــ کل وہ -

پر اُس کے ابّا یہی کہتے رہے کہ سب گپ ہی گپ ہے - لوگ بے کار ڈر رہے ہیں اور بھاگ رہے ہیں - جو جہاں ہے اُسے وہیں جما رہنا چاہئے - بھلا مجال ہے کسی کی کہ دوسرے کو اس کے گھر سے نکال دے ؟ اجی کیا غدر ہے بھلا ؟ یہ اندھیر نہیں ہو سکتا ــــ اور پھر ہمیں کیا ڈر ؟ کوئی خطرہ ہوگا بھی تو جھٹ اپنے گاؤں چلے جائیں گے ......

اور پھر جیسے ایک دم سے دلّی میں قیامت ٹوٹ پڑی - ہر طرف خون خرابا اور لوٹ مار کا بازار گرم تھا - اس کے چچا اور خالہ پہلے ہی جان بچا کر بھاگ چکے تھے پر اس کے ابّا تو اصرار پر بھی نہ مانے - پر اب ــــ اب تو وہ بھی بدحواس تھے - پر جائیں کہاں ؟ گاؤں کا راستہ خطرناک، کہیں اور ٹھکانا نہیں ــــ پیسہ پاس نہیں ــــ

ماں سخت بدحواس، باپ بھائی خوف زدہ، ننھے بچّے سہمے پر وہ جانے کیوں مگن تھی ــــ لوگ خواہ مخواہ ڈرتے ہیں - بھلا ڈر کاہے کا، کیا کوئی گھر سے نکال دے گا - !

اگر لوگ اپنا گھر ڈر کر چھوڑ کر نہ بھاگ جاتے تو بھلا گنڈے کیسے ان پر قبضہ کر سکتے تھے ؟ بہادری سے اگر اپنی جگہ انسان ڈٹا رہے تو کس کی ہمت ہے کہ اُسے ستائے - ؟

نوجوان خون اس کی رگوں میں دوڑ رہا تھا ــــ وہ نڈر تھی، بہادر تھی بہادر تھی اور بہت ہی ناتجربہ کار اور دنیا کے حالات سے ناواقف محض !

اور آخر ــــ آخر ــــ وہ دن آگیا ــــ

ہر طرف سے شور و غل کی آوازیں، آگ کے شعلے اور گولیوں کا شور ــــ جانے یہ گولیاں تھیں ؟ فسادیوں پر یا بے گناہ مصیبت ماروں پر ؟

ماں سب بچّوں کو سمیٹے اللہ اللہ کر رہی تھی ــــ باپ اور بڑا بھائی ایک پڑوسی کی مدد سے جو کئی دن سے کہہ رہا تھا کہ تم یہاں سے نکل بھاگو - کسی سواری کا انتظام کرنے گئے ہوئے تھے ــــ اور وہ جیسے آج پہلی مرتبہ خطرے کا احساس ہوا تھا اور پوری طرح ہوا تھا - گھبرائی گھبرائی اوپر سے نیچے، نیچے سے اوپر، کمرے سے دالان میں، دالان سے صحن میں پھر رہی تھی ... کیا ہوگا ؟ وہ کیا کرے گی ؟ اگر اس وقت غنڈے گھر میں گھس آئے تو ؟ مرنے سے وہ نہیں ڈرتی - مرنا تو ایک ہی دن ہے آج مرے یا کل ــــ پر آہ ــــ وہ ــــ پاس پڑوس سے کیسی کیسی خوفناک وحشت خیز خبریں سننے میں آئی ہیں - عورتوں کے

ساتھ کیسے کیسے شرمناک ظلم کیئے جاتے ہیں ـــ اس خیال کے ساتھ اُس کا کنوارا جسم لرز اٹھتا ہے ـــ رات ہی تو ابا اماں سے کہہ رہے تھے "اصلی مصیبت تو بدنصیب لڑکیوں والوں کی ہے ـــ ان بدبختوں کا جو اس منحوس زمانے میں پیدا ہوئیں موت پردہ ڈھک لے۔ لڑکیوں کے ساتھ جو جو سلوک ہو رہے ہیں ـــ"

وہ اس سے زیادہ نہ سُن سکی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کان بند کر لئے۔ اور پھر رات بھر کے روحانی کرب اور سخت کش مکش کے بعد اس نے ایک آخری فیصلہ کر لیا ـــ اگر ـــ اگر کوئی "ایسا" موقع آیا تو وہ سب کچھ چھوڑ دے گی ـــ ماں باپ کی محبت، بہن بھائیوں کی چاہ، ہونے والی شادی کا دل خوشکن تصور، اپنے منگیتر کا عشق، اپنی جوان امنگیں، حسین آرزوئیں...... وہ ان سب کو خیرباد کہہ دے گی ـــ سب سے منہ موڑ لے گی۔

صبح کو اس نے کس معصومیت کے انداز میں ابا سے پوچھا "بابا کیا خودکشی اتنا بڑا گناہ ہے کہ خودکشی کرنے والا ہمیشہ دوزخ میں جلتا ہے؟ اور بابا ـــ کیا آخرت کا دوزخ ـــ دنیا کے جہنم سے بھی زیادہ خوفناک ہو سکتا ہے؟"

باپ کو بیٹی کا مطلب سمجھنے میں ذرا سی بھی دیر نہیں لگی۔ اس کا بدن لرزا، آنکھیں جھکیں اور آواز کانپ گئی "بیٹی سُنا تو یہی ہے کہ خودکشی بہت بڑا گناہ ہے۔ پر ـــ اللہ ـــ اللہ بخشنے والا ہے ـــ بڑے بڑے گناہ بخش سکتا ہے ـــ اور پھر اپنی جان لینا ـــ دوسروں کی جان لینے سے تو کہیں کم گناہ ہوگا ـــ پھر بھی ـــ پھر بھی اپنی جان بچانا آخری دم تک انسان کا فرض ہے بیٹی ـــ"

اس کی بھی صراحی دار گردن خود بخود جھک گئی، جھکی ہوئی سیاہ دراز پلکوں کا سایہ زرد رخساروں پر کانپنے لگا اور دو گول گول آنسو لڑھک کر جوش سے اُبھرتے اور گرتے ہوئے سینے پر گر کر اوڑھنی میں جذب ہو گئے "پر جان سے بھی زیادہ اگر کوئی اور چیز پیاری ہو تو اس کا بچانا تو عورت کا ایمان ہے بابا"، باپ کا جواب خاموش آنسو تھے۔ جو آنکھوں میں لرزے اور وہیں خشک ہو گئے۔

اب ـــ وہ نیچے سے اوپر اور اوپر سے نیچے بے قرار پھر رہی تھی۔ دل بلیّوں اچھل رہا تھا۔ ہاتھ پاؤں سرد تھے، مگر چہرے پر عزم و استقلال کا رنگ نکھر رہا تھا۔

شور ـــ غل ـــ ہنگامہ ـــ اور پھر اس کے دروازے پر چوٹیں...... ماں چاروں چھوٹے بچوں کو لے کر اندر اسباب کی کوٹھری میں گھس گئی اور اس کو بلاتی رہی، خوشامد کرتی رہی، پر وہ وہاں نہ ٹھیری اس نے ایک مرتبہ ماں کے گلے میں باہیں ڈالیں، منہ پر منہ ملا "اماں جی خدا حافظ" اور لپک کر بھاگی۔ دروازہ چرچرا رہا تھا۔ ماں نے اندر سے کوٹھری بند کر لی اور ٹرنک صندوق کھینچ کھینچ کر دروازے میں اڑانے لگی۔

وہ لپک کر کوٹھے پر چڑھ گئی اور جھکی جھکی جا کر گائے کیلئے چھت پر جو چارہ ڈھیر کیا ہوا تھا اُس میں چھپ گئی۔ اس نے پہلے ہی سے اس میں چھپنے کی جگہ بنا لی تھی۔ اندر گھس کر آہستگی سے اس نے پولیاں اپنے اوپر رکھیں اور ڈھیر کو برابر کر دیا۔

کان میں آوازیں آتی رہیں.... قدموں کی چاپ، شور و غل، گالیوں کی آوازیں، قہقہوں کا شور، بچوں کی دردناک چیخیں، ماں کی ایک باریک اور دل کے پار ہو جانے والی چیخ، اور پھر ـــ پھر ـــ دوڑنے بھاگنے، چیزوں کو توڑنے پھوڑنے کی آوازیں ـــ پھر ـــ ایک ٹرک کی آواز، گولیوں کے دھماکے سپاہیوں کی باتیں ـــ زخمی ـــ اسپتال ـــ اور لاری کے اسٹارٹ ہونے کا شور ـــــــ

اس کی ساری قوتیں شل ہو چکی تھیں۔ صرف ایک سننے کی حس باقی تھی، اس کا سارا بدن مجسم کان بن گیا تھا ـــ اور پھر چند لمحے خاموشی رہی.... چند لمحے یا چند صدیاں؟ اُسے تو صدیاں ہی معلوم ہوئیں ـــ طویل ـــ سرد ـــ بے حس صدیاں اُسے ایسا لگ رہا تھا جیسے جُگ بیت گئے ہیں اور وہ اس ڈھیر میں پڑی ہوئی ہے ـــ اور پھر آخر ـــ ایک مرتبہ اور شور و غل کی آواز نے اس خوفناک سکوت کو توڑا۔

گالیاں بکنے کی آوازیں۔ چیزوں..... چیزوں کو توڑنے پھوڑنے کا شور..... اور پھر ایک تیز آواز "وہ سالا کہتا تھا اس گھر میں ایک بڑی حسین لڑکی ہے۔ بہت سا سامان ہے۔ دھوکا دیا..... لگادو آگ.. کچھ بھی نہ ہاتھ لگا یہاں تو..... لگاؤ آگ لگاؤ ـــ" اور وہ سانس روکے بے حس و حرکت پڑی رہی۔

چری نے آگ پکڑ لی اور شدید گرمی سے بوکھلا کر بے ارادہ وہ ایک دم کھڑی ہوگئی۔ چاروں طرف آگ کے شعلے بلند تھے اور ان کی آتشیں زبانیں ہر طرف سے نکلنے کے لئے اس کی طرف لپک رہی تھیں ...... ہاں ایک طرف کا ذرا سا حصّہ ایسا تھا جہاں سے اگر وہ گلی میں کود جاتی تو اس آگ سے وہ بچ سکتی تھی ــــ مگر نیچے جہنم کی آگ سے بھی زیادہ خوفناک آگ کا کنڈ موجود تھا ــــ وہاں وحشی درندے کھڑے قہقہے لگا رہے تھے ــــ وہ گولی کھائی ہوئی ہرنی کی طرح تڑپ کر پیچھے ہٹ گئی۔

اگنی دیوی ہر طرف سے اس کے سواگت کے لئے بڑھی اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ اگنی ماتا کی آغوش ماں کی پُر محبت آغوش کے برابر ہے جو اُسے ان درندوں سے بچانے کیلئے اپنا دامن پھیلائے اُس کی طرف بڑھ رہی ہے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ ہاتھ آسمان کی طرف دعا کیلئے اُٹھے ہوئے تھے، اس کے کپڑوں سے شعلے بلند ہو رہے تھے اور یہ سیجّی "ستی" بے حس و حرکت اور شانت کھڑی تھی ...... سرخ روشنی میں اُس کا سندر چہرہ آسمان سے اُتری ہوئی کسی اپسرا کی طرح چمک رہا تھا ....

ایک اور سخت دھچکا میرے دماغ کو لگا .....

گاڑی آہستہ آہستہ اسٹیشن چھوڑ رہی تھی اور دور سے آواز آ رہی تھی ــــ "مہندی ــــ مہندی ــــــــ فرید آباد کی مشہور مہندی ــــ"

...ــــــــــ...

علی حمّاد عبّاسی

غزلُ

محبّت ترک کر کے دِل کو بہلانے کہاں جاتے؟
رِہا ہوتے بھی زنداں سے تو دیوانے کہاں جاتے؟

چمن ہو یا کہ ویرانہ ہر اک سُو آگ بھڑکا دی
بچھڑ کر تیرے میخانے سے دیوانے کہاں جاتے؟

تری محفل کو اُجڑے ایک مدّت ہو گئی لیکن
جو سوزِ غم میں جلتے ہیں وہ پروانے کہاں جاتے؟

شکستوں نے مجھے اندازۂ ذوقِ طلب بخشا
نہ سمجھاتے جو یوں دل کو تو سمجھانے کہاں جاتے؟

علی عباس حسینی

سُرخ لکیر

بے سوچے سمجھے اس نے کچھ لکھنا شروع کیا، لکھنے کے لئے سوچنا یا سوچنے کے لئے کچھ لکھنا شروع کیا ——

در اصل وہ کچھ لکھنا چاہتا تھا، مگر لکھتا تو کیا لکھتا۔ رومان؟ سو اِس کا اس کا اس زمانے میں کیا پتہ؟ یہ تو وہ زمانہ تھا جس میں غیر متوازن دماغوں والی سوکھی جوانیاں تھیں، ایسی جنکی رگ رگ میں غلاظتیں بھری پڑی تھیں۔ جنھیں سڑے ہوئے سماج کی متعفّن نالی کے رینگتے کیڑے اور بدبودار حوض کی چھوٹی بڑی کیڑیاں کہنا زیادہ درست تھا۔ نہ ان میں اپج، نہ حوصلہ، نہ اُمنگ، نہ ولولہ، نہ جوشش، نہ بے ساختہ ہنسی، نہ بھرپور قہقہہ۔ ایسے میں رومان کہاں؟ پھر فن کار کیا کرے؟ حقیقت نگاری؟ تو وہ پورے اپنے ہی دکھڑے رونا ہوا۔ کب تک سب کے سامنے ٹسوے بہاتے بسورتے پھرے؟ —— اور اس میں ندرت ہی کہاں ہے۔ کس کو یہ دکھ نہیں جھیلنا پڑ رہے ہیں۔ کون ہے جس کی خوشی کی بنیاد غم پر نہیں ہے؟ کون ہے جس کے قہقہوں کے خاکستر میں رنج واندوہ کی چنگاریاں دبی ہوئی نہیں سلگ رہی ہیں! پھر وہ کیا لکھے اور کیونکر لکھے؟

بیوی رات سے بیمار...... پڑی ہے۔ بیماری بھی کچھ عجیب سی ہے۔ سویرے سے بیچاری بستر سے اُٹھ نہیں پاتی نہ تو کہیں درد بتاتی ہے، نہ کہیں کوئی زخم ہے، نہ کھانسی، نہ بخار۔ رات سوتے سوتے اس نے ہاتھ بڑھا کر شوہر کو جگایا تھا۔ "مجھے رضائی اُڑھا دو" اس نے بھی نیند میں کچھ خیال نہ کیا۔ دن بھر کا تھکا ماندا تھا۔ بیکاری سب سے تھکا دینے والا کام ہے — اس نے رضائی اڑھا دی اور سو گیا — مگر صبح سے نہ تو منورما سے اٹھا جاتا ہے، نہ بولا ہی جاتا ہے۔ جب بولنا چاہتی ہے لفظ حلق میں آکر اٹک رہتے ہیں۔ جب اٹھنے کا ارادہ کرتی ہے، ارادہ صرف کروٹ لے کر رہ جاتا ہے — وہ اپنی منورما کو اس طرح ایک نامعلوم بیماری کی گہرائیوں میں ڈوبتا دیکھ کر گھر سے نکلا

ڈاکٹر بلانے کی ہمت نہ پڑی۔ لمبی فیس کہاں سے دیتا، پڑوس والے حکیم صاحب کو لے آیا۔

انھوں نے بتایا رات میں سخت قلبی دورہ پڑا تھا۔ پھر موٹی رضائی اوڑھ کر سو رہنے سے پسینہ بھی بہت آیا۔ اسی سے کمزوری ہے۔ انھوں نے تاکید کی مریضہ ذرا سی بھی حرکت نہ کرنے پائے، بس چت لیٹی رہے، کروٹ تک نہ لے اور حکم دیا کہ بار بار دودھ دیا جائے اور قوّت کی دوائیں کھلائی جائیں نسخہ جو تجویز ہوا تھا وہ خاصا قیمتی تھا۔ سفوف ذہب، جواہر مہرہ اور خدا جانے کیا کیا۔ اس کے پاس اتنے پیسے بھی نہ تھے کہ وہ اس مہنگے نسخے کے دام دے سکے۔

وہ بیوی سے کہہ کے باہر آیا کہ "ذرا میں نسخہ بندھوانے کی فکر کروں" مگر وہ باہر ہی کمرے میں سوچنے لگا کہ نسخہ بندھے تو کیونکر بندھے۔ اس نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا تو کل سوا بارہ آنے نکلے۔ اس نے پیسے مٹھّی میں دبا لئے اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔

دفعتہً رُک کر اس نے دیوار پر آویزاں مرقع کو دیکھا ایک آرٹسٹ ساتھی کا تحفہ تھا۔ بڑا اچھا فن کار تھا رمیش۔ نہ جانے کیسے کیسے شاہکار پیش کرتا وہ دنیا کے سامنے۔ لیکن آجکل وہ جیل میں سڑ رہا تھا۔ اس لئے کہ وہ سیاست میں حصّہ لینے لگا تھا۔ "کیا ضرورت ہے فن کار کو سیاست میں پڑنے کی" وہ بڑبڑایا لیکن وہ غیر شعوری طور پر اس تصویر پر آنکھیں گڑائے کھڑا رہا۔

عیسےٰ کی مقدس ماں گود میں شیر خوار عیسےٰ کو لئے پلنگ پر لیٹی تھی۔ اس کے سُتے ہوئے چہرے اور جھکی جھکی پلکوں سے بے پناہ تھکن کا اظہار ہو رہا تھا۔ جیسے عیسےٰ کی محترم ماں مدّت العمر کسی زبردست بوجھ کو اٹھائے چلتی رہی ہو، چلتی رہی ہو اور منزل پہ پہونچ کر نڈھال ہو کر گر پڑی ہو اور بالکل اس کی بیوی

کی طرح اس سے اُٹھا نہ جاتا ہو۔

اس نے چونک کر سوچا "مریم کو سہارا دینے والا کون تھا؟"۔۔۔۔ یہ حد درجہ پریشان کن سوال اس کے سر میں گونجنے لگا۔ اور وہ سر تھام کر میز کے قریب کرسی پر دھم سے بیٹھ گیا۔ اور اس سوال کے جتنے حل اس وقت تک دنیا کے مفکروں نے پیش کئے ہیں سب پر ایک ایک کر کے نظر ڈال گیا۔ لیکن اس کا کوئی جواب نہ ملا کہ ضروریات زندگی کے مہیا کرنے کیلئے سہارے کی ضرورت ہی کیوں باقی رکھی جائے۔؟

حکومت ہی کیوں نہ یہ بار اپنے ذمے لے لے؟ پیدائش سے موت تک کسی شہری کو دستِ سوال پھیلانے کی ضرورت ہی کیوں پڑے؟۔۔۔ اس نے دفعتاً محسوس کیا وہ سیاست کی سرحد میں داخل ہو رہا ہے۔ وہ سر کو جھٹکا دے کر بڑبڑایا۔ "فن کار کو سیاست سے کیا سروکار؟" اور اس نے قلم اور کاغذ گھسیٹ کر بے سمجھے بوجھے کچھ لکھنا شروع کیا۔ لکھنا شروع کیا۔ لکھنے کے لئے سوچنا یا سوچنے کے لئے لکھنا شروع کیا۔۔۔

دراصل وہ کچھ لکھنا چاہتا تھا، مگر لکھتا تو کیا لکھتا۔ رات سے اس کی منورما بیمار تھی، وہ بھی اس طرح کہ دل بیٹھا جا رہا ہے، نبضیں ڈوبتی جا رہی ہیں اور علاج کے لئے اس کے شوہر کی جیب میں صرف سوا بارہ آنے پیسے!

اس نے مٹھی کھول دی، ہتھیلی پسیج گئی تھی اور پیسے بھیگ گئے تھے، اسے بڑی گھن معلوم ہوئی۔ یہ پیسے کن کن ہاتھوں سے مس ہوتے ہیں۔ گندے فقیروں کے ہاتھوں سے، لنگڑے لولوں کے ہاتھوں سے، مبروصوں کوڑھیوں کے ہاتھوں سے اور اُن کے ہاتھوں سے جو انسانی غلاظت کو صاف کرتے پھرتے ہیں، برہمنوں کی نسلی برتری دراصلتاً اس کے خون میں رچی ہوئی تھی وہ آخری خیال پر سارے جسم پر سے گھگھیا اٹھا اور میز پر پیسے گراتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا کہ ہاتھ دھو ڈالے، مگر۔۔۔ مگر کھڑے ہوتے ہی اسے خیال آیا کہ یہی پیسے حسین و معطّر جیبوں میں بھی کھنکتے ہیں۔ انھیں پیسوں سے رومانی تحائف خریدے جاتے ہیں، انھیں پیسوں سے اونچے اونچے شیش محل کھڑے کئے جاتے ہیں، انھیں پیسوں سے نیکی و بدی خریدی جاتی ہے۔ انھیں پیسوں سے ضمیر و جسم کا سودا ہوتا ہے، انھیں پیسوں کو ٹاٹا برلا کہتے ہیں، انھیں پیسوں کا ایک نام امریکہ ہے، جو بین الاقوامی تجارت کے پلڑوں کو اونچا نیچا کرتا رہتا ہے، اور ...... اور انھیں پیسوں کی دوا ملتی ہے، انسانی زندگی کو موت کے منہ سے چھین لانے والی دوا۔ اس کی اپنی منورما کی دوا، جو رات سے نڈھال پڑی اسے نرگسی آنکھوں سے تک رہی ہے۔ اور بے زبان نگاہوں سے کہہ رہی ہے کہ "مجھے بچا لو، مجھے موت کے فولادی ہاتھوں سے چھڑا لو۔ تم توانا ہو، تندرست ہو، قوی ہو، مرد ہو، کاٹ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو مبیتوں کو اور بہا لاؤ جوئے شیر کو کہ میں تمہارے سر میں تیل ڈالتی ہوں اور سر کے نیچے چاندی جیسی باہوں کے تکئے لگا دیتی ہوں! میں ٹھنڈی گھنی چھاؤں ہوں، تم تھکے ماندے مسافر! چھاؤں سرک گئی تو بیٹھو گے کہاں؟ جھلستی دھوپ میں؟"

اس کے دل میں ہوکیں اُٹھنے لگیں۔ وہ جلتی آنکھیں لئے میز پر جھکا۔ وہ سوا بارہ آنے پیسوں پر منہ رکھ کر خشک سسکیاں لینے لگا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے دھیرے دھیرے سر اٹھایا اور قلم اُٹھا کر اور کاغذ کھینچ کر بے سوچے سمجھے کچھ لکھنا شروع کیا۔ لکھتا گیا شروع کیا، لکھنے کے لئے سوچنا۔ سوچنے کے لئے لکھنا شروع کیا۔۔۔

اس کے قلم نے لکھا "موہن غریب ہے"۔ لکھتے ہی اس نے فوراً جملے کو قلم زد کر دیا۔ وہ اس کٹے ہوئے جملے کو خوفزدہ نظروں سے تکنے لگا۔ نہ جانے کیوں اُسے اس جملے سے بے انتہا خوف معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اس نے بے سوچے سمجھے مداری کی پٹاری کھول دی ہو اور اس میں سے پھپکاریاں مارتے ہوئے سانپ نکل پڑے ہوں۔ وہ جھجک کر پیچھے ہٹا۔ اس نے دیدے نکال کر اس سادہ سے فقرے کو پڑھا "موہن غریب ہے"۔ اس اکیلے موہن میں سے اسے بھوکے ننگوں کا ایک کارواں سر و پا برہنہ چلتا نظر آ رہا تھا، جس کا ہر مسافر کسی گرتی ہوئی دیوار کی طرح آگے کو جھکتا جا رہا تھا۔۔۔ جھکتا جا رہا تھا۔ زمین پر گر پڑنے کیلئے، گر کے ڈھیر ہو جانے کیلئے، خون اور لاشوں کا ڈھیر، جو سڑ گل کر ایک دن زمین کا کھاد بن جاتا ہے!

"موہن غریب ہے"، اس نے قلم زد جملے کو ایک بار پھر دیکھا اور اب کے اسے محسوس ہوا، جیسے اس کٹے ہوئے جملے کے پیچھے اس کی بیمار منورما جاں کنی کے عالم میں پڑی اسے حسرت بھری نظروں سے تک رہی ہے۔

اس نے گھبرا کر "غریب" کے لفظوں کو کئی دفعہ کاٹا۔

—— متوازی اور مستقیم خطوط کھینچ کر کاٹا، اوپر سے کاٹا نیچے سے کاٹا۔ اس طرح کاٹا کہ چار خانے سے بن گئے۔ چھوٹی بڑی بہت سی صلیبیں! مگر اسے محسوس ہوا کہ "غریب" مصلوب ہونے پر اور بھی اُجاگر ہو گیا۔ اسنے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا پھر جلدی جلدی اپنے لمبے ناخونوں سے اس لفظ کو کھرچنا شروع کیا۔ وہ "غریب" کو کھرچتا رہا، کھرچتا رہا، یہاں تک کہ اس جگہ کا کاغذ اڑ گیا۔ اور اس کاغذ میں آنکھ سی بن گئی، مفلسی سے بے نور، تکلیف لے کر اپنی بھوک سے بلبلاتی، سماجی ظلم سے فریاد کرتی آنکھ۔ اسکی منورما کی طرح یاس سے بھری آنکھ!

اسے اچانک دوا کا خیال آیا اور وہ اُٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس نے سوا بارہ آنے پیسے سمیٹ لئے۔ ان کو پھر سے گنا۔ موہوم سی امید تھی شاید رقم بڑھ گئی ہو، مگر پیسے اتنے ہی نکلے، پورے سوا بارہ آنے! اس نے جھنجھلا کر انھیں مٹھی میں کس کے بند کر لیا اور بھینچی ہوئی مٹھی کوٹ کی جیب میں رکھ لی۔

ابھی وہ دو قدم بھی نہ چلا تھا کہ دھماکے کی آواز آئی۔ جیسے جڑ سے کٹی ہوئی کچی دیوار برسات میں ڈھے جائے۔ اس نے لپک کر اندر دیکھا۔ اس کی بیوی بستر سے الگ زمین پر پڑی ہے اور اس کے منہ سے خون کی لکیر نکل کر زمین پر کچھ لکھ رہی ہے — اور اسے محسوس ہوا جیسے اسکی بیوی نے قلم زد فقرے "موہن غریب ہے" کے نیچے سرخ لکیر کھینچ دی ہے!

ٹھاکر پونچھی

بلور خاں

شیر خاں کے بیٹے، بلور خاں کی عمر ۲۶ سال تھی۔ اور قد کوئی ۵ فٹ ۶ انچ رنگ گورا۔ پیشانی کشادہ اُبھرے ہوئے کولھے، بال سُنہری، تحصیل سدھوتی موضع چندی ماڑی ریاست پونچھ کا رہنے والا تھا، یہاں اس کی دس بیگھے زمین تھی۔ اور ایک مکان۔ اور مکان کے ساتھ ہی اس کے باپ، ماں اور دس سال کی بہن فروزاں کی قبر تھی۔ موضع چندی ماڑی میں وہ بلور خاں قاتل کے نام سے مشہور تھا۔ کیوں کہ اس نے اپنے جگری دوست الف خاں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور قتل کے اس واقعہ کے ساتھ جو اس کا تعلق تھا۔ اس کے بارے میں موضع چندی ماڑی میں مختلف قصے اور متضاد باتیں تھیں ——— مثلاً چودھری ولی خاں کا کہنا تھا۔ کہ بلور خاں نے الف خاں کو اِسلئے قتل کیا تھا۔ کیوں کہ بلور خاں چندرو سے محبت کرتا تھا۔ اور الف خاں چندرو پر ناجائز اور اوچھے ہتھیاروں سے اُسے مغلوب کر کے اپنے حلقۂ اثر میں رکھنا چاہتا تھا ———

رام دھن ہشر کے شعور میں بھی ایسے ہی خیالات مرتسم تھے۔ لیکن شودوالے کے پجاری چھوٹو باوا کا کہنا تھا۔ کہ اس قتل کا اس محبت سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ الف خاں اپنے ذاتی مفاد کی خاطر رات کو چندرو کے کھیتوں کا پانی توڑ کر اپنے کھیتوں میں لگا دیتا تھا جس سے اسکے کھیتوں میں دھان کی فصل سُوکھ رہی تھی ——— وہ گاؤں بھر میں روئی۔ گڑگڑائی لیکن کسی کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ بلور خاں نے بھی یہ چیخ پکار سُنی۔ الف خاں کو منع کیا طعنہ و تشنیع کی، لیکن وہ نہ مانا۔ اور تُو تُو، میں میں آخر یہاں تک نوبت پہونچی، کہ یہ قتل وقوع پذیر ہوا ——— کیوں کہ بلور خاں یہ نہ چاہتا تھا۔ کہ چندرو کے کھیت تباہ ہوں۔ اسکے کھیتوں میں دھان کی بالیاں مرجھا کر سر جھکا دیں اور وہ دلنے دلنے کے لئے گاؤں گاؤں کی خاک چھانے اور پیٹ کی خاطر اپنا جسم بیچے، اپنی عصمت گنوائے۔ کیوں کہ یہ کھیت ہی اس کا سہارا تھے۔ اس کے ماں، باپ، بھائی، بہنیں اور رشتہ دار، یہ ہی اُس کا محبوب تھے، اور سرمایۂ حیات، جن کی بدولت آج تک اُسے کسی کے آگے جھولی نہ پھیلانی پڑی تھی۔ جنھوں نے اسکی عزت و آبرو کو محفوظ رکھا تھا۔ اور بلور خاں چندرو کا یہ سہارا ٹوٹتے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ اُسے اسکے نتائج کا پورا علم تھا اِسلئے اس نے اپنے دوست الف خاں سے جھگڑا مول لیا۔ اور اسی جھگڑے میں وہ اسکے ہاتھوں مارا گیا۔

اور چندرو؟ ——— وہ بیس سال کی ایک خوبصورت ہندو بیوہ تھی۔ ویسے تو موضع چندی ماڑی کی ہر ایک چیز خوبصورت تھی۔ خوب صورت اور جاذب نظر؟ ——— لیکن چندرو کے چہرے پر ایک عجیب سا حُسن تھا ——— خودرو پھولوں کی طرح قدرت کی ساری رعنائیاں اور رنگینیاں اپنی پلکوں میں لئے ہوئے۔ ایک عجیب سی آوارگی؟ نیلگوں آسماں پر اُڑتی ہوئی سپید سپید بدلیوں خودرو جنگلی پھولوں کی نشیلی مہک اور چندی ماڑی کی ساکن و غیر متحرک جھیل میں ناچتی ہوئی چاند کی روپہلی کرنوں کی طرح آوارہ الھڑ اور وحشی کائنات کی سی معصوم، مقدس سادگی، تصنع و بناوٹ سے دور ...... اور اس کا رد عمل گاؤں کے ہر ایک بچے، بوڑھے، جوان، مرد اور عورت پر یکساں تھا۔ ان کے ایک جیسے جذبات اور احساسات، صرف ادائیگی میں تضاد تھا ——— چندی ماڑی کا کوئی رت جگا، کوئی بیاہ شادی، دیوی دیوتاؤں، پیر پیغمبروں کا کوئی میلہ اس وقت تک اپنے عروج پر نہ پہونچتا، جب تک چندرو اس میں شرکت نہ کرتی۔ حتیٰ کہ چھوٹو باوا آرتی لئے شودوالے کے باہر دروازے کے پاس کھڑا گھنٹوں گھنٹی بجاتا رہتا، ہنمناتا رہتا اور جمائیاں لیتے ہوئے سامنے ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیوں پر نظریں جمائے اس کی راہ تکتا رہتا۔ وہ شودوالے میں ہر روز آتی تھی

لیکن بلور خاں قاتل کی محبت میں فلسفہ تھا۔ زندگی تھی، وسعت اور ایک ہمہ گیر جذبۂ اُلفت اور عقیدت، اسکی نظر میں چندی ماڑی کا گاؤں ایک بہت بڑا گھر تھا۔ اور اس میں رہنے والے ایک ہی کُنبے کے

افراد، اسکی ہر ایک چیز پر سب کا برابر کا حق، چودھری دلی خاں رام دھن شرسے لے کر تیز و ڈوم اور کالے خاں لوہار کو وہ ایک ہی نظر سے دیکھتا تھا اور انکی خوشی و غم میں وہ ایک ہی اُمنگ ایک ہی ولولے اور ایک ہی اشتیاق کے ساتھ شریک ہوتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ تاریکی کے ڈھلتے ہوئے کالے سایوں میں جب پنگھٹ کی پگڈنڈیاں سنسان ہو جاتیں، نظر نہ آنے والے پہاڑی پرندے سروں سے پھڑپھڑاتے ہوئے گزر جاتے، گاؤں کی الھڑ لڑکیوں کی الھڑ سرگوشیاں، بیباک نقرئی قہقہے اور جھانجھنوں کی ہلکی مدھم چاپ، آبشاروں کی شہد آگین لے میں تحلیل ہو کر پہاڑوں میں گم ہو جاتی، چندی ماڑی کا حسن جب سو جاتا تو وہ پنگھٹ پر بیٹھ کر سیف ملوک گاتا اور اس سوئی ہوئی وادی میں اونگھتے ہوئے لافانی حسن کو خواب راحت سے جگاتا۔

باغاں دے وچ بلبل بولے۔ قصاں دے وچ پانی

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

۔۔۔۔۔ نہ معلوم کیوں؟ چندی ماڑی کے آبشاروں کے مقدس خواب آگیں گیت۔ بدمست ہواؤں کی حیات افروز لوریاں ایک دم خاموش ہو جاتیں اور اپنے آنگنوں میں بیٹھی ہوئیں معصوم کنواری دوشیزاؤں کی دھڑکنیں تیز ہو جاتیں۔ اور وہ آسمان پر ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کی ضیا میں کھو کر نہ معلوم کیا پانے کی جستجو کرتیں۔۔۔۔۔۔۔ اور بلند آواز گاتے گاتے ایک دم سیف ملوک کے الفاظ اس کے ہونٹوں پر جم کے رہ جاتے۔ اور وہ سوچتا کہ گاؤں کے سارے لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں۔ اسے رزیل، کمینہ اور قاتل سمجھتے ہیں۔ کیوں کہ اس نے الف خان کو جان سے مار دیا تھا۔ الف خاں جو اسکے بچپنے کا ساتھی تھا، جس کے ساتھ مل کر وہ سیف ملوک گایا کرتا، بڑوں میں مال مویشی چراتا۔ جس کے ساتھ وہ روزانہ ڈاب میں تیرتا۔ جس کی قبر پر اب بھی وہ بلا ناغہ ہر روز پھول چڑھاتا تھا، جس کی قبر پر اس نے پنج تارے کا ایک درخت لگا دیا تھا۔ جس کے نیچے بیٹھ کر وہ رات بھر سیف ملوک گاتا تھا۔۔۔۔۔۔۔!

اُسے ایسا معلوم ہونے لگتا، جیسے الف خاں قبر میں سے ہی اس کا ساتھ دے رہا ہے۔ اسکی آواز میں آواز ملا کر گا رہا ہے۔۔۔۔۔۔۔

بلور خاں پھانسی کی سزا سے بچ گیا تھا۔ کیونکہ اس کے خلاف کوئی شہادت نہ تھی۔ مسلمانوں نے یہ جان کر کہ وہ مسلمان ہے۔ اور ہندوؤں نے یہ مدِ نظر رکھ کر کہ اس نے ایک ہندو بیوہ کے لئے قتل کیا ہے۔ عدالت میں شہادت نہ دی۔ اور ثبوت نہ ملنے پر اس نے شک سے فائدہ اٹھایا۔ اور وہ موت کے منہ سے بچ گیا۔ لیکن گاؤں والوں کی نظر میں قاتل آخر قاتل تھا۔ اور قاتل سے جتنی بھی نفرت کی جائے کم ہے۔ سارا گاؤں اس سے نفرت کرتا تھا۔ اسکی پرچھائیں تک سے بھاگتا تھا۔ لیکن یہ سب کچھ دیکھتے اور جانتے ہوئے بھی اسے گاؤں والوں اور اپنے گاؤں سے عقیدت تھی ایک والہانہ محبت اور اپنے کو وہ ان کی خوشی اور غم کا شریک سمجھتا تھا۔۔۔۔۔ کیوں کہ وہ موضع چندی ماڑی تحصیل سدھونتی کے رہنے والے تھے۔ یہاں اسکی دس بیگھے زمین اور ایک مکان تھا۔ اور اسکے باپ، ماں اور چھوٹی بہن فروزاں کی قبریں تھیں۔ جن پر بلا ناغہ وہ ہر روز پھول چڑھاتا تھا۔۔۔۔۔ سیف ملوک گاتا تھا۔ اور یہاں کے لوگ اس سے نفرت کرتے تھے۔ اور اسے بلور خاں قاتل کے نام سے پکارتے تھے۔

وقت تیزی سے گزرتا گیا؟

بہار آئی؛ پورے جاہ و جلال کے ساتھ؟؟

پھر خزاں آئی، تباہ و خستہ حال؟؟؟

پھر بہار اور خزاں دونوں وارد ہوئیں؟؟؟؟

غلامی کی زنجیریں آخری بار ایک دوسرے سے ٹکرائیں ایک شور بلند ہوا، مہیب، بھیانک گہرا شور، جیسے سمندر کی اتھاہ گہرائیوں کو انسانوں نے چھو لیا ہو۔ جیسے عرش سے تارے نوچے جا رہے ہیں۔۔۔۔ لیکن سمندر کی اتھاہ گہرائیوں کو کون چھو سکا؟ اور عرش سے تارے بھی کیسے نوچے جا سکتے تھے؟۔۔۔۔ یہ لوگوں کا واہمہ تھا۔ حقیقتاً غلامی کی زنجیروں کو توڑنے سے پہلے آزادی کے لئے قیام، رہائش اور پھولنے پھلنے کے لئے ماحول، فضا اور مقدس جگہ کا انتظام کیا جا رہا تھا۔ صدیوں سے قفس کے اندر بے پر بند پڑے پنچھی کی اڑان کے لئے وسعت اور بلندی کی ضرورت تھی اسلئے خاردار جھاڑیوں اور کھردری اور ناہموار سطح کو صاف اور ہموار کیا گیا۔ ان کو دور کرنے کے لئے آگ، کتر بیونت کے لئے تلواروں اور کرپانوں کا بے دریغ استعمال کیا گیا، ناہموار اور کھردری سطح کو ہموار کرنے کے لئے سرنگوں کو اڑانے والے گولے پھینکے گئے۔ اور توازن، ترتیب اور تواتر کو قائم رکھنے کے لئے۔۔۔ گاؤں تقسیم ہوئے۔ زمینیں اور دریا تقسیم ہوئے۔ عورتیں اور بچے تقسیم ہوئے۔ سب نے دیکھا۔ کسی نے کہا، یہ بہار ہے۔ کسی نے کہا نہیں خزاں ہے۔ اور جو زیادہ سنجیدہ تھے انہوں نے کہا خزاں اور بہار دونوں؟

۔۔۔۔۔ چندی ماڑی کی بستی بھی یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔۔۔۔۔

لوگ سب کچھ سنتے، دیکھتے اور سمجھتے رہتے۔ پھر صرف دیکھتے ہی لگے۔ سمجھ بوجھ کی طاقتیں سلب ہو گئیں...... چندی ماڑی اور اسکے ساتھ کے گاؤں میں ہندوؤں کی آبادی زندہ تھی اسلئے وہاں کے مسلمان سدھونتی خاص میں چلے آئے۔ بلور خاں مسلمان تھا۔ اس کا نام بلور خاں تھا، وہ وہاں کیسے رہ سکتا تھا۔ اور ایک رات اُسے اپنا گاؤں چھوڑنا پڑا۔ اپنے گاؤں کے ہندوؤں کو چھوڑنا پڑا۔ اپنے کھیت، مکان اور بزرگوں کی قبروں کو چھوڑنا پڑا —— شام کے دھندلے بھیانک بدبودار سایوں میں اُس نے آخری بار چندی ماڑی کو دیکھا مسجد کے مینار اور مندر کے کلس کو دیکھا، جن کی سر بفلک چوٹیاں صدیوں سے اپنی علیحدہ علیحدہ عظمت لئے ہوئے، پرانے ساتھیوں کی طرح ایک ہی منزل کی طرف بڑھتے بڑھتے جیسے تھک گئی تھیں۔ آخری بار اس نے پنگھٹ کی ٹیڑھی میڑھی الجھی ہوئی راہوں کو دیکھا پگڈنڈیوں کو دیکھا، جو خاموش تھیں۔ جیسے ان کے گیت، ان کی دھڑکنیں، انکی آواز کسی نے چھین لی ہو۔ جیسے ان میں کبھی آواز پیدا نہ ہوگی۔ کبھی بہار نہ آئے گی، کبھی موسم نہ بدلے گا، کبھی راحت انگیز ہوائیں نہ چلیں گی۔ آخری بار اس نے اپنے بزرگوں کی قبروں پر پھول چڑھائے۔ آخری بار وہ الف خاں کی قبر پر گیا۔ اور قبر پر کھڑے ہو کر آخری بار اس نے بلند آواز سیف ملوک گایا......

باغاں وِچ بلبل بولے قصاں وِچ پانی

جنھیں ساڈے سجن چھوڑے صبر انا دی جانی

وہ بلند آواز سے گاتا رہا۔ گاتا رہا...... پھر چٹان کا سینہ پھٹ گیا۔ ایک چشمہ ابل پڑا۔ وہ رونے لگا۔ اپنی آنکھوں میں پہلی بار اس نے آنسو چھلکتے دیکھے۔ پہلی بار وہ گڑگڑایا۔ پہلی بار اس نے خدا سے دعا مانگی، زندگی میں پہلی بار اس نے محسوس کیا۔ اس نے کچھ کھویا تھا۔ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اُس نے چندی ماڑی کی بستی کا طائرانہ جائزہ لیا۔ اس کے دل میں صرف ایک حسرت تھی۔ کہ آخری بار وہ چھوٹو یا واسے نہ مل سکا۔ آخری بار وہ ان سے نہ مل سکا۔ جواب وہاں موجود نہ تھے۔ آخری بار وہ؟ —— پھر وہ یوں ہی مسکرا دیا۔ اس نے ایک گھونٹ میں سارے آنسو پی لئے...... سامنے الف خاں اپنے کھیتوں میں ابدی نیند میں مدہوش تھا —— اپنی فضا، اپنی زمین اور اپنی نیند —— وہ کتنا خوش قسمت تھا...... اور اس نے دیکھا چاروں طرف تاریک رات جل رہی تھی۔ گولیاں چل رہی تھیں۔ ڈھول اور نفیریاں بج رہی تھیں اور شہنائیاں جیسے چٹانوں سے جاگ اٹھی تھیں۔ جیسے کسی بوڑھے مہاجن یا بوڑھے سرمایہ دار کی برات ہو۔ جس کے بڑھاپے اور عمر کو اس شور و شر میں دبایا جا رہا ہو...... اسے ایسا معلوم ہوا۔ کہ ان گولیوں، دھماکوں اور آگ میں سرمایہ داری کا آزادی سے نکاح ہو رہا ہے۔ عجیب قسم کی آوازیں تھیں —— عجیب قسم کی صدائیں۔ جیسے قبریں پھٹ رہی ہوں۔ مردے جاگ رہے ہوں۔ ساری دنیا جل رہی ہو، انسانیت، عوام، افراد، کلچر، سماج سب آگ کی بھٹی کے نذر ہو رہے ہوں...... شراب تقسیم ہو رہی تھی۔ گولیاں تقسیم ہو رہی تھیں۔ عورتیں تقسیم ہو رہی تھیں۔ عزت و آبرو، عصمت و عفت تقسیم ہو رہی تھی۔ بچے، بوڑھے، بیمار، ضعیف بھیڑ، بکریوں کی طرح بانٹے جا رہے تھے۔ اس نے آسمان پر نگاہیں دوڑائیں۔ وہی ستارے تھے، وہی چاند، وہی فضا اور نیچے دریا کی روانی میں وہی شور، وہی رفتار، وہی راستہ —— وہ سوچنے لگا کیا یہ بھی راستہ بدل دینگے؟ کیا انکی بھی تقسیم ہوگی؟ ——

چاروں طرف آگ ہی آگ تھی؟

چاروں طرف گولیاں ہی گولیاں؟؟

چاروں طرف شور ہی شور؟؟؟

اسکے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی پیدا ہوئی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرنے لگا۔ یہ ہندوؤں کا علاقہ تھا اور پار سامنے مسلمانوں کا —— یہاں ہندوؤں کے مورچے تھے۔ وہاں مسلمانوں کے۔ یہاں ہندو آگ تھی، وہاں مسلمان آگ۔ یہاں ہندو گولیاں تھیں وہاں مسلمان گولیاں۔ یہاں ہندوؤں کا شور تھا۔ وہاں مسلمانوں کا۔ لیکن مقصد ایک تھا۔ راستہ اور منزل بھی ایک۔ یہاں ہندو رہ سکتے تھے، وہاں مسلمان؟ —— اور جو انسانیت سے محبت کرتے ہیں۔ ان انسانوں کے لئے کہاں جگہ ہے؟......

گولیاں اس کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ بجلی کی سی تیز رفتاری سے اپنا راستہ کاٹ رہا تھا ——

کئی دن وہ حواس باختہ سدھونتی میں پڑا رہا بچے، بوڑھوں اور عورتوں کی چیخیں اُسے سنائی دیتی رہیں۔ وہ سُنتا رہا؟ —— چودھری ولی خاں کا نوجوان اکلوتا بیٹا دلیر خاں چندی ماڑی

میں ہی رہ گیا تھا - اور اس کی خوبصورت نوجوان عورت جس کے پیٹ میں چھ مہینہ کا ایک بچہ تھا - ولی خاں کے سامنے ہی اس کا کام تمام کر دیا گیا تھا - اور اس کے بدلے میں چندی ماڑی کی ہندو عورتیں، بچے اور بوڑھے سدھونتی میں لائے گئے تھے - وہ سنتا رہا - اُسے ایسا معلوم ہوا - جیسے اس کے سوچنے اور سمجھنے کی طاقتیں ایک ساتھ ختم ہو گئی ہیں —

پندرہ تاریک راتیں جن کی کالی بھیانک سیاہی میں لاشوں کی سڑاند اور آگ کا دھواں رچا ہوا تھا - گزر گئیں - اس بدبودار تاریکی میں بلور خاں نے تحصیل سدھونتی کی چٹانوں - جنگلی خاردار جھاڑیوں کے نیچے چھپے ہوئے لاتعداد ہندو بچے، عورتیں اور مرد ڈھونڈھ نکالے - اور انہیں چندی ماڑی کی سرحد پر چھوڑ آیا - ان پندرہ راتوں میں اس نے ایک پل بھر کے لئے بھی آرام نہ کیا - ایک لمحے کے لئے بھی آنکھ نہ جھپکائی دشوار گزار گھاٹیوں پر وہ رات بھر چلتا رہتا راستہ طے کرتے جب چھوٹے بچے تھک جاتے تو وہ انہیں اپنے کندھوں پر اٹھا لیتا ——— کسی نے کہا، تم سانپ کے بچوں کو دودھ پلا رہے ہو؟ ——— کسی نے کہا، بھیڑیے کے منہ میں ہاتھ دے رہے ہو ——— کسی نے کہا، مہیب گڑھے کو پھلانگنے کی جستجو کر رہے ہو - جو ایک دن تمہاری قبر ثابت ہوگا - وہ سنتا رہا - زیر لب مسکراتا رہا - اور اپنے کام میں بدستور منہمک رہا ———

رات بھیانک تھی - دشوار گزار گھاٹیوں پر ایک گہرا خوفناک سناٹا تھا - کبھی کبھار اس مہیب سناٹے کو چیرتا ہوا - کوئی ہوائی گولا چیختا چنگھاڑتا کسی پہاڑی پگڈنڈی پر جا گرتا - آج وہ چندی ماڑی کے درّے سے آ رہا تھا، یہاں وہ رام دھن مشر کو چھوڑنے گیا تھا، گھاٹی کے تنگ موڑ پر ایک کتا رو رہا تھا - دو گیدڑ اس کا راستہ کاٹ کر بھاگ گئے - اس نے سوچا یہاں کسی کی لاش ہے - وہ آگے بڑھا - ایک لاش تھی ——— وہ اس کے پاس کھڑا ہو گیا - عورت تھی - اس نے دیا سلائی جلا کر اس کے چہرے کو دیکھا - وہ چندرو تھی - جس کے بازو پر گولی لگی تھی - جو چندی ماڑی کی طرف سے آئی تھی - ایک ہندو گولی نے ایک ہندو بیوہ کو مار دیا تھا .... لیکن وہ زندہ تھی - اس نے اسے کندھوں پر اٹھایا اور چندی ماڑی کی سرحد کو جانے والی پیچدار پگڈنڈیوں پر ہو لیا ———

گولیوں میں بدستور تبادلہ ہو رہا تھا
ہوائی گولے چیخ رہے تھے -

شب تاریک آخری سانس لے رہی تھی - بھیانک مہیب سناٹا ٹوٹ رہا تھا - اور وہ چندرو کو اٹھائے چندی ماڑی کے درّے کو عبور کر رہا تھا - جس کے نیچے جھیل تھی - یہاں سے ہندوؤں کا علاقہ شروع ہوتا تھا -

جھیل پر پہونچکر اس نے چندرو کا زخم دھو یا مرہم پٹی کی اسکے منہ میں پانی ڈالا - آنکھوں پر پانی کے چھینٹے دیئے - چندرو نے پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھا - بلور خاں؟ — اس نے آنکھیں موند کر ایک بار پھر دیکھا - بلور خاں؟ . . .

ہاں! چندرو میں بلور خاں قاتل ہوں، تمہیں چندی ماڑی تک پہونچانے کے لئے تمہارے ساتھ آیا ہوں -

"یہ جانتے ہوئے بھی - کہ دن چڑھتے ہی تمہیں اپنی جان کا خطرہ لاحق ہوگا - تم نے ایسا کیا"

میں جانتا تھا - چندرو - لیکن مجھ سے زیادہ تمہاری جان کو خطرہ تھا، اور اب تم خطرے سے دور ہو - اب تم جاؤ - تم چندی ماڑی کی امانت ہو - اسکی روح؟ — وہ دیکھو؟ چندی ماڑی کی پگڈنڈیاں کسی بچھڑی ہوئی سہیلی کی طرح باہیں پھیلائے تم سے گلے ملنے کے لئے بے قرار ہیں — وہ دیکھو؟ وہ دیکھو؟؟ پنگھٹ پر دیودار کا بوڑھا درخت جس کے نیچے بیٹھ کر میں شام کے دھندلکوں میں کھو کر کچھ پانے کی جستجو کرتا تھا - گم سم کھڑا کسی کی راہ تک رہا ہے - وہ دیکھو؟ آسمان پر بکھرے ہوئے تاروں کی طرح سیف ملوک کے بول پہاڑی پگڈنڈیوں پر تمہارے منتظر ہیں - وہ دیکھو؟ چندرو چھوٹا با دا صبح کی آرتی اتارتے ہوئے تمہاری راہ تک رہا ہے - وہ دیکھو؟ کائنات کا ذرہ ذرہ پکار اٹھا - چندرو آ گئی - چندرو آ گئی - وہ دیکھو تمہارا راستہ تکتے تکتے صبح کے ستارے کی بھی آنکھیں پتھرا گئیں - اور اب کوئی پل کا مہمان ہے - - - - -

گولیوں میں بدستور تبادلہ ہو رہا تھا؟
کبھی کبھار زور کا دھماکہ ہوتا - جیسے کوئی پہاڑ پھٹ گیا ہو

"دن چڑھ آیا ہے، چندرو - اب تم جاؤ -"

"بلور خاں تم کب آؤ گے؟"

میں ایک دن ضرور آؤں گا، چندی ماڑی میں میرا بالپن ہے

جوانی ہے۔ میں وہاں ضرور آؤں گا۔ وہاں میرے باپ، ماں اور چھوٹی بہن فروزاں کی قبر ہے۔ وہاں میرے دوست ہیں۔ میرے ساتھی ہیں۔ چندی ماڑی میرا گاؤں ہے۔ میرا گھر ہے۔ میں وہاں ضرور آؤں گا۔ ہم ایک دوسرے سے گلے ملیں گے۔ ایک دوسرے سے محبت کرینگے۔ ایک دوسرے کی خوشی و غم میں پہلے کی طرح شریک ہوں گے۔ چندی ماڑی کا گاؤں ایک بار پھر جی اٹھے گا۔ اسکی خزاں زدہ فضاؤں میں ایک بار پھر بہار کے پھول کھل اٹھیں گے۔ اس کے آنگن کنواری دوشیزاؤں کی پائل کی جھنکاروں سے پھر مترنم ہو اٹھیں گے ـــــ بلور خاں قاتل چندی ماڑی کے کھیتوں میں سے سیف ملوک گاتا ہوا گزرا کرے گا۔ چندر و میں ضرور آؤں گا ـــ ہم سب ایک دوسرے سے خوشی سے بھرے ہوئے آنسوؤں سے ملیں گے۔ کوئی کسی سے نفرت نہیں کرے گا۔ حق نہیں چھینے گا۔ خون نہیں بہائے گا۔ شکوہ شکایت نہیں کرے گا۔ اور ہم اندر ہی اندر اپنے کئے پر پچھتائیں گے۔ اور اپنے خدا اور بھگوان کے حضور میں دعا کرینگے۔ کہ ایسا دَور دنیا میں کبھی نہ لانا۔ ایسا دور لانے والے انسان دنیا میں پیدا ہی نہ کرنا؟

گولیوں میں بدستور تبادلہ ہو رہا تھا

سورج کی شعاعیں ایک پہاڑ کی اوٹ سے ابھر رہی تھیں

چندر و چندی ماڑی میں داخل ہو رہی تھی۔

اور بلور خاں سینے پر دونوں ہاتھ رکھے۔ چندی ماڑی میں سورج کو چڑھتے دیکھ رہا تھا۔ ایک گولی اسکے سینہ میں پیوست ہو چکی تھی۔ اور خون بہہ رہا تھا۔ بہتا ہوا خون جھیل کی نیلاہٹ میں تحلیل ہو رہا تھا ـــــ جھیل جو نہ ہندوؤں کے علاقہ میں تھی نہ مسلمانوں کے علاقے میں .... جھیل جو بلور خاں کے چہرے کی طرح خاموش اور غیر متحرک تھی۔ لیکن اس کے اندر نہ جانے کتنا ہیجان، کتنا کرب اور کتنا اضطراب تھا؟ اور چندی ماڑی کے لوگوں کا محافظ ـــــ چندی ماڑی میں سدا بہار رہی بہار دیکھنے والا ـــــ اس کی امانت کا نگہبان ـــ انسانیت کا ساتھی ـــــ الف خان کو موت کے گھاٹ اتارنے والا ـــــ اور چندرو سے محبت کرنے والا ـــ بلور خاں ـــ قاتل نہ جانے خود اب کہ خزاں زدہ فضاؤں کے کس گوشے میں ہمیشہ کے لئے ابدی نیند سو گیا۔

اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہ تھی ـــ آنسو بھی نہ تھے۔ ایک انتظار تھا۔ ایک امید تھی۔

اس صبح نو کی جو اپنے ساتھ نئی بہاریں، نئی زندگی، اور نئے انسان لائے گی؟

غزل

قمر ہاشمی

نہ مسکرائے افق پر فضائے تیرہ شبی ۔۔۔ دراز دامن شب ہی جو مختصر ہو جائے

یہ شب گزیدہ ستارے جو ڈوبتے بھی نہیں ۔۔۔ دعائیں مانگ رہے ہیں کہ اب سحر ہو جائے

وہ اک نظر جسے گستاخ کر دیا تم نے ۔۔۔ یہ چاہتے ہو کہ اب فرشِ رہگذر ہو جائے

سلگ رہی ہے جو سینوں میں انقلاب کی آگ

عمل کی چھوٹ سے دہکے تو تیز تر ہو جائے

قدّوس صہبائی

خاکے

خوش نصیبی

" آپ سے ملئے، مسٹر اعجاز، ایڈیٹر نئی جوانی، کہو بھئی اعجاز، بہت دن میں دکھائی دئے، خیریت تو ہے!"

" شکر ہے، خیریت ہی خیریت ہے، آج کا دن تو بہت ہی خوش نصیب اور خوش گوار ہے"

" واقعی! ...... لیکن دنیا میں بہت کم ایسے خوش نصیب ہیں جو ایسا کہہ سکتے ہیں"

" ہاں، ہاں، میں کامل یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ آج میرا دن بہت ہی خوشگوار گذر رہا ہے۔ بلکہ مجھے یہ کہنا چاہئے کہ قسمت ایسے دن بہت کم لاتی ہے"

" واقعی تم بہت بشّاش دکھائی دے رہے ہو، آخر ہوا کیا؟ کیا کوئی لاٹری وغیرہ جیت لی!"

" لاٹری تو کیا —— مگر ہاں! ...."

" سناؤ، سناؤ! میں اس بات کو سننے کیلئے بہت بے چین ہوں۔ کیا ہوا آخر؟

" کیا ہوا؟! بہت کچھ ہوا، ایک سانس میں تم سے سب کچھ نہیں کہا جا سکتا —— سب سے پہلے تو یہ سنو کہ آج میں دریا میں گرنے سے بچ گیا"

" معاف کرنا بھئی! بات میری سمجھ میں نہیں آئی ......!"

" اوہو، بات کوئی غیر معمولی اور الجھی ہوئی تو نہیں صبر کر کے سنو کہ قصّہ ختم کر لوں — آج جتنا نفیس اور دلکش دن کٹا ہے اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔ نہ تو میں آج دریا میں گرا نہ میں نے بالا خانے سے چھلانگ لگا کر خودکشی کی کوشش کی کسی ٹرام، ٹرین اور موٹر کے سے دب کر بھی نہ مر سکا ......!"

" بھئی سنو تو آخر یہ کیا ...... یہ کیا ہو گیا تمہیں!"

" مجھے تو اپنی بات ختم کر لینے دو۔ میرا دن بڑا خوش نصیب اور خوشگوار گذر رہا ہے۔ کیونکہ مجھ پر ہیضہ کے جراثیم سرایت نہیں کر سکے —— نہ sahara کے تپتے ہوئے ریگستانوں میں کسی جگہ ریت کے تودوں کے نیچے دب کر مرا، نہ قطب شمالی کے علاقے میں برف کے نیچے منجمد ہو کر رہ گیا —— اس بات کے بتانے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ دریائے یانگسی میں آج جو جہاز گولہ باری سے ڈوب گیا ہے میں اس کے ساتھ ڈوبنے والے چھ سو آدمیوں میں سے نہیں ہوں۔ چھ سو انسان، کم بخت چھ سو بد نصیب جیتے جاگتے انسان — لیکن میں اکیلا حرف میں، میں ان چھ سو میں سے نہیں ہوں ———— کتنی خوش نصیبی کی بات ہے کہ میں اُن لوگوں میں سے نہیں ہوں جو آج چین، برما، اور انڈونیشیا کی لڑائیوں میں مارے گئے ہیں —— اور اس بات کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں کہ آج بیوی صاحبہ نے ایک بار بھی لڑنے کی نوازش نہیں فرمائی اور میرا لڑکا مڈل کے امتحان میں نقل ٹپّی کر کے پاس ہو گیا —— " کیا شک ہے خوش نصیبی میں! آج کا دن مبارک ہے کہ پولس نے مجھے " سرقہ" غبن اور نقب زنی کے الزاموں میں سزائے موت نہ دی۔ نہ کسی سی آئی ڈی نے میرے " دائیں بازو" کے پروپگینڈے کی رپورٹ انسپکٹر جنرل پولس کے پاس بھیجی۔ اس سے بھی زیادہ خوش نصیبی کی بات یہ ہے کہ محمد علی روڈ پر جو پانچ منزلہ عمارت گر گئی ہے میں نہ اس کا مالک ہوں نہ اسمیں رہتا ہوں۔ اور جہاں میں رہتا ہوں اس مکان کو کسی نے جلا کر راکھ نہیں کر ڈالا۔ اگر کوئی اس قسم کی کوشش کرتا تو یقین ہے کہ مکان راکھ کا ڈھیر ہو جاتا۔ تب کہیں جا کر فائر بریگیڈ کی آواز سنائی دیتی مگر اس کا پمپ تب بھی کام نہ کر سکتا ——

" یہ تھوڑی سی خوش نصیبی کی بات ہے لیکن ایک خاص بات

یہ ہے کہ ایک افسانہ نگار ہونے کے باوجود میری کوئی کہانی کسی فلم کمپنی نے نہیں خریدی۔ ورنہ ڈائرکٹر کی حسین زبان میں۔ "منسی جی، منسی جی! بس ایسا اسٹوری مارو! کہ سالا لوگ بھڑک بھڑک اٹھے"، جیسے جلسے سننے پڑتے اور وہ گھونسہ تان تان کر "سالا کمیونسٹ لوگ" کو گالیاں دیتے اور میں سنتا رہتا۔ حالانکہ ہندوستان میں اب بھی ہزاروں لاکھوں سینما ہیں اور منسی جی لوگ ایسا اسٹوری مار رہا ہے کہ سالا لوگ بھڑک بھڑک اٹھتا ہے ذرا غور کرو کہ کس طرح خوش قسمتی نے میرے اوپر اپنے حسین پروں کو پھیلا دیا ہے۔ کسی خدا کے بندے نے آج مجھے نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا اور میں سوسائٹی میں کوئی ایسا "انڈسٹریل میگنٹ" بھی نہیں جسے اپنے فرنیچر کے ہماٹ نہ ہونے کا دن بھر صدمہ رہا ہو۔ میں کسی انگریز کی طرح غسل خانے میں بھی مردہ نہیں پایا گیا نہ میں کسی شوقین فلم اسٹار کے عاشق کی طرح تیرتے ہوئے سمندر میں ڈوبا ـــــ اور آج کوئی زلزلہ بھی نہ آیا جس کے جلتے ہوئے لاوے کے ابلتے چشموں میں چور چور ہو کر رہ جاتا۔ آج بھی فرقہ وارانہ فساد ہوئے لیکن کسی نے مجھے ہندو یا مسلمان سمجھ کر میرے سینے میں خنجر نہ بھونکا اور آج بھی میں نے بلیک مارکیٹ سے غلّہ نہیں خریدا۔

ـــ "اور اس کے آگے سنو! میرے آخری مضمون کی کتابت میں کسی قسم کی غلطی کاتب صاحب نے نہیں فرمائی جو ہمیشہ "صحافت" کو "حماقت" لکھنے کے عادی ہیں۔ دفتر میں ٹیلیفون کی گھنٹی پر ایک بار بھی مجھے کسی نے تکلیف نہیں دی البتہ مالک صاحب کو برابر بلاوے آتے رہے۔ کیونکہ میں جو کچھ اخبار میں لکھتا ہوں لوگ سمجھتے ہیں کہ انھیں نے لکھا ہے۔

ـــ اور آج مجھے اپنی "حماقت" یا "صحافت" کے نتیجے میں جیل خانے یا پاگل خانے بھی نہیں بھیجا گیا۔

ـــ میری والدہ کی بد دعائیں آج بھی قبول نہ ہوئیں۔ اور میرے بچے ناک سُڑ سُڑتے، ننگے پتنگے سارے محلے میں حسب معمول دوڑتے پھرے اور کسی نے ان کا نوٹس نہیں لیا۔ حالانکہ کل ہی میں نے "تربیت اطفال" پر ایک لاجواب مقالہ سپرد قلم کیا ہے۔

ـــ "سب سے اہم بات یہ ہے کہ دنیا میں آج کے دن قیامت نہیں آئی نہ اُس کی آمد کی کوئی افواہ پھیلی، نہ شائبہ پیدا ہوا حالانکہ دلوں پر عرصہ دراز بلکہ ازل ازل سے قیامت کا تصور دہشت ناک ہیبت جمائے ہوئے ہے۔

"تم ہی کہو اس عدیم المثال دن کی خوش گواری میں تمہیں اب بھی کوئی شبہ ہے.....؟

"بالکل نہیں بالکل نہیں، میں آج ہی اس دن کے سبجکٹ پر ایک معرکتہ الآرا نظم لکھوں گا۔ شاعری حقیقت پسندی کے سوا کیا ہے آخر ــــ میرا خیال ہے کہ تم آج اسی خوشی میں جشن مناؤ اور ایک ایک پیگ برانڈی کے بعد رات کے کھانے کا پروگرام شروع ہو۔ میں تمہیں دعوت دیتا ہوں کہ یہ پروگرام میرے مکان پر قبول کرو...... کیونکہ مجھے آج ہی آل انڈیا مشاعرہ میں شرکت کیلئے سوا دو سو روپیہ وصول ہوئے ہیں اور اس کا مصرف ــــ......"

"بڑی نوازش، بڑی مہربانی! لیکن سوچو تو کہ جس انسان نے اتنا نفیس، اتنا لطیف، اتنا خوش نصیب دن گذارا ہو وہ کس طرح تم جیسے قلاّش شاعر کی دعوت قبول کر سکتا ہے ...... ذرا سوچو! جبکہ صبح کا کھانا تک مجھے اور میرے بچوں کو میسر نہ ہو سکا ہو تو شام کے کھانے کا کیا سوال ہے؟"

ـــ "کیوں! کیوں، آخر بات کیا ہوئی؟ کیا تمہیں فرصت نہیں ملی؟"

"فرصت کو کیا کہئے ـــ اصل میں کل سے میرے پاس ایک پائی نہیں ہے، نہ گھر میں غلّہ ہے، نہ دال ہے نہ چاول ہیں نہ گھی ہے۔ پھر کیا کھاتا ـــ تین مہینے سے مالک عذر کر کے تنخواہ نہیں دیتا۔ اس کا خیال ہے کہ وہ دیوالیہ ہو رہا ہے کیونکہ سٹے میں پچاس ساٹھ ہزار ہار چکا ہے۔ پھر بھی کوئی ہرج کی بات نہیں۔ جو آدمی اتنا خوشگوار دن گذار لے اس کے لئے اور اس کے بچوں کے لئے دن بھر کھانا تقریباً غیر ضروری ہے اور مجھے امید ہے کہ تم میری اس رائے سے اتفاق کرو گے۔

"اچھا خدا حافظ!"

"خدا حافظ"

دوسری بھوک

حمید نے کہا — "میں بھوکا ہوں —"

رام چندر اس کا ساتھی قیدی بولا — "بیٹا یہ جیل ہے، وقت پر ملے گی —"

"گدھا ہے تو —— میں روٹی کا بھوکا نہیں — میں بھوکا ہوں، اس بھوک کو کیا کہوں، یہ دوسری بھوک ہے، دوسری! ——"

"گدھا ہے تو گھاس کھا، دوسری اور تیسری بھوک سالا کہیں کا ——" رامچندر نے بھی مذاق کیا۔

"مذاق نہیں رام چندر تو اس بار بالکل بے گناہ پھنس گیا۔"

دونوں عادی مجرم تھے۔ چور، اُچکے، نقب زن، لُچے لفنگے، غنڈے۔ لیکن اس بار رام چندر سچ مچ بے گناہ پھنس گیا تھا۔ بغیر جانے بوجھے، بغیر پوچھے تاچھے وہ اس کے ساتھ ہو لیا تھا۔

حمید نے ایک سیٹھ جی کے مکان میں نقب لگایا۔ رام چندر سمجھا کہ بڑا بھاری ہاتھ مارے گا اس بار —— مگر حمید نے روپیہ پیسہ، مال زیور، کسی چیز کو ہاتھ نہ لگایا۔ نہ رامچندر کو کوئی چیز چھونے دی —— بلکہ وہ سیدھا سیٹھ کی خواب گاہ میں گھس گیا۔ جہاں اس کی حسین بیٹی منورما کے سرہانے بیٹھ کر دیر تک وہ سوئی ہوئی دوشیزہ کو دیکھتا رہا —— پھر اپنے دونوں ہاتھوں میں منورما کا چہرہ اس نے ایک جذبۂ احترام کے ساتھ تھام لیا۔ اور حسن خوابیدہ کی پیشانی چوم لی۔

رام چندر حیران تھا کہ حمید کیا کر رہا ہے لیکن وہ ساتھی کی اس وارفتگی کو دیکھ کر نہ برہم ہوا، نہ معترض بلکہ اس کے احساس میں ایک ہمدردی کا سرچشمہ اُبل پڑا۔

منورما چیخ مار کر اُٹھ بیٹھی۔ دونوں چور بھاگنے کے لئے تیار ہوئے مگر سنبھلنے سے پہلے ہی دھر لئے گئے۔ پولس بہت دیر سے اُن کا پیچھا کر رہی تھی۔

رامچندر نے کہا — "ابے، گناہ اور بے گناہ کیا؟ جیل تو اپنا اصل گھر ہے — لیکن تو نے اب کے خالی خولی عشق میں پھنسوا دیا ——"

"—— رامچندر سُن لے، عشق وشق کچھ نہیں، میں بھوکا ہوں ایک اچھی صورت کو چٹ کر لینا چاہتا ہوں۔ سیٹھ جی کی چھوکری کی صورت مجھے بھا گئی ہے ——"

"—— اُلّو کے پٹھے یہی چیز تو عشق ہے — حسن کی تلاش اور حسن پر قبضہ کی خواہش کو ہی عشق کہتے ہیں۔ اسی لئے اب ہم تجھے مجنوں کا باپ کہا کریں گے ——"

گناہ

شراب بندی کی تحریک کا لیڈر بیمار ہو گیا۔ ڈاکٹر نے علاج سے مایوس ہو کر کہا — "تم شراب پیو"

لیڈر نے جواب دیا —— "ڈاکٹر! شراب بندی میرا اصولِ زندگی ہے، میں اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا —— یہ انقلابی نہیں تعمیری دور ہے"

"تو پھر زندگی سے ہاتھ دھو لو ——" ڈاکٹر چلا گیا۔ لیڈر کی بیوی نے بوتل سے شراب انڈیلی۔ ایک سانس میں بغیر سوڈا ملائے لیڈر اسے چڑھا گیا۔ پھر اور مانگی، اور پی اور مانگی اور پی گئی، اور مانگی اور مانگی، اور!

بیوی کو غصہ آ گیا، جھنجھلا کر بولی — "بس اب نہیں ملے گی ——"

"کیوں —— ؟"

"بہت ہو گئی ——"

"ہو جانے دو"

"ڈاکٹر کے سامنے پرہیزگاری کی کیا وجہ تھی ——؟"

"پوچھنے کی کیا بات ہے، میں شراب بندی کا لیڈر ہوں۔ شراب نوشی کا اقرار گناہ تھا ——"

"اور چھپ چھپ کر پینا —— ؟"

"اوہ ڈاکٹر اناڑی ہے —— اصل میں میرا مرض کثرتِ مے نوشی ہے۔ اور گناہ! —— تو گناہ وہ ہے جس سے لوگ واقف ہو جاتیں ——"

ناپشیمان

"اوہ کم بخت! ناپشیمان! تو تو عورت پر بھی ہاتھ

اُٹھاتا ہے، سوچ تو ذرا!" ماں نے بیٹے کو غیرت دلائی۔
"میرے نزدیک مرد و عورت میں کوئی امتیاز نہیں ۔۔۔"
بیٹا بولا۔
"مگر ۔۔۔" بیٹے نے ماں کو بات نہیں کرنے دی۔
"اگر مگر کچھ نہیں۔ مزدور پر مجھے پورا اختیار حاصل ہے۔
یہ کام کا اور کمانے کا معاملہ ہے۔ پشیمانی کا نہیں ۔۔۔"
"مگر تیری مہذب سوسائٹی نے بھی تو عورت کا درجہ اونچا
مانا ہے ۔۔۔"
"مگر میری مہذب سوسائٹی نے عورت کو مزدوری سے
اب تک نہیں روکا ہے"
"پیسے کے لالچ میں تو بے جگر، بلکہ بے عقل ہو گیا ہے"
"نہیں پیسہ کمانے کے لئے عقل کی ضرورت ہے اور نفع
کے لئے عقل کا تقاضہ ہے کہ ظلم کیا جائے۔ مظلوم عورت ہو
یا مرد ۔۔۔"
"تجھے خدا کو جواب دینا ہے ۔۔۔"
"خدا نہ چاہتا تو یہ کچھ نہ ہوتا، مجھے خدا نے اس کی
اجازت دی ہے ۔۔۔"
"تو کافر ہے۔ دہریہ ہے۔ خدا پر یہ الزام ۔۔۔!"
"تم ناقص العقل ہو ۔۔۔ میں سرمایہ دار بن رہا ہوں
اگر روزانہ اس عورت کو یا عورتوں کو کاہلی میں وقت گزارنے
دوں تو پانچ فی صدی نقصان ہو جائے ۔۔۔"
سرمایہ داری مزدور کی جنس و نوع کو نہیں دیکھتی وہ
اس کی محنت اور اپنے فائدے سے اندازہ لگاتی ہے۔

جلال ملیح آبادی

غزل

پھر مرا سروِ خراماں، آگیا
خندہ بر لب، گل بداماں آگیا

گل ہنسے، کلیاں کھلیں، مہکی نسیم
جانِ گل، جانِ گلستاں، آگیا

مژدہ ہو تجھ کو، دلِ فرقت نصیب
مصر میں پھر ماہِ کنعاں، آگیا

رقص کر اے شاکئ دورِ خزاں
وہ تمنّائے بہاراں، آگیا

عشوہ و افسون ادا و دلبری
وہ سراپا فتنہ ساماں، آگیا

صدر بزمِ صبحِ رنگیں بل گیا
مونسِ شامِ شبستاں، آگیا

وجد کر اے قلبِ پروانہ مزاج
غیرتِ شمعِ فروزاں، آگیا

چھڑ گیا وادی میں سازِ آبشار
مطربِ فصلِ بہاراں، آگیا

دوستدارِ ساغر و مے، مل گیا
دشمنِ اربابِ ایماں، آگیا

باقر مہدی

واپسی

مال روڈ پر ساجد آہستہ آہستہ چلا جا رہا ہے اُس کے پاس سے پھٹے حال لوگ گذر رہے ہیں وہ سب شستہ اردو میں بات چیت کر رہے ہیں۔ ان کے لباس، ان کے خد و خال، ان کے زرد سے کملائے ہوئے چہرے چمکتی ہوئی پیشانیاں اس بات کی شاہد ہیں کہ یہ لوگ اس سرزمین کے باشندے نہیں ہیں۔ ان کی حالت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ ہم یہاں زبردستی آئے ہیں۔ تمہارا ہم سے کوئی تعلق نہیں۔ کوئی رشتہ نہیں، صرف تم ہم مذہب ہو۔ وہ پلٹ پلٹ کر لاہور کے باشندوں کو دیکھتے ہیں۔ جیسے کہہ رہے ہوں تم ہمارے کیسے ہو سکتے ہو جب ہمارے ہم وطن، ہمارے پڑوسی ہمارے ساتھی اپنے نہ ہو سکے۔ ان کی چمکتی ہوئی پیشانیاں، بکھرے ہوئے بال، نازک سے خد و خال جیسے کہہ رہے ہوں کہ ہماری طرف کیوں گھورتے ہو۔ ہم دلی کے شہزادے ہیں، اکبر کے بیٹے ہیں۔ ساجد مُسکرایا کیا یہی سوچ رہے ہوں گے جو میں سوچ رہا ہوں۔ اس کے سامنے سے ایک گندمی رنگ کی دوشیزہ عجیب انداز سے مسکرائی جیسے رو پڑے گی۔ دوشیزہ نے ایک نظر ساجد کی طرف دیکھا اور سر جھکا دیا جیسے کہہ رہی ہو ہمیں نہیں پہچانتے؟ نادر نے ہماری ہی چوڑیوں کو توڑ دیا تھا اور تمہیں چنگیز کے ہاتھوں نے ہماری ہی کلائیاں مروڑی تھیں اور اب اپنے ہاتھوں لٹ کر آئی ہوں۔ ساجد نے اس کی طرف مڑ کر دیکھا وہ تھوڑی دور جا چکی تھی اور پھر ہجوم میں غائب ہو گئی۔ نہ جانے اسے کیوں خیال آیا کہ واقعی ہمیں نے عورتوں کو اشیاء میں تبدیل کر دیا ہے۔ انسان سے فروخت ہونے والے سامان کا روپ دے دیا ہے۔ وہ کشمیری گیٹ کی طرف مڑ گیا اور پھر کچھ سوچ کر تیز تیز چلنے لگا۔ اسے صبح کی باتیں یاد آ گئیں۔ ماں شادی کو کہتی ہیں۔ مگر جس سے شادی کرنا چاہتا ہوں وہ تو اپنے وطن میں آگ کی نذر ہو گئی۔ نہ جانے وہ کتنی بار اغوا شدہ لڑکیوں کے دفتر میں اس کو پوچھنے آیا تھا قریب قریب اسے دو ماہ گزر چکے تھے کہ وہ ہر روز اسی مال روڈ اسی کشمیری گیٹ کا چکر لگایا کرتا تھا۔ کیا پتہ وہ زندہ بھی ہو یا نہ ہو اس کے گھر والے تو ضرور ہی مار ڈالے گئے ہوں گے۔ سُنا ہے دلی میں کوئی .... تو پھر ہاں وہ اس سے آگے سوچنا چاہتا تھا وہ اغوا شدہ لڑکیوں کے دفتر میں جلدی سے اندر چلا گیا۔ اور پھر وہی روز کی مایوسی۔ لیکن اس میں ایک امید کی کرن تھی۔ ناظم دفتر نے اسے بتایا تھا کہ وہ دو سو لڑکیاں جلد لاہور پہنچنے والی ہیں۔ اور ان لڑکیوں کے ناموں کی فہرست پرسوں دینے کا وعدہ کیا تھا جب وہ دفتر سے باہر نکلا تو سڑک پر بجلی کے قمقمے جل رہے تھے۔ چہل پہل تھی لیکن جب بھی اس کو لوگوں کے چہرے جانے پہچانے نہ معلوم ہوتے۔ اُسے محسوس ہوتا جیسے یہاں کے باشندے لاہور کو اجاڑ کر گئے ہیں۔ لاہور کی آبادی بڑھ گئی تھی لیکن اس کی رونق کہاں گئی۔ اُس نے گردن جھکا لی اور آہستہ آہستہ گھر کی طرف چلنے لگا۔ جیسے وہ شرمندہ ہو اپنے ناکردہ گناہوں کے لئے۔ اپنے ہم مذہبوں کے جرم کے لئے —

اپریل کا مہینہ شروع ہو چکا تھا لاہور میں یوں گرمی آ گئی تھی جیسے یہاں سردی کبھی آتی ہی نہیں۔ ساجد تو اسی شدت کی گرمی میں پروان چڑھا تھا، اس کو تو بچپن سے اس چلچلاتی ہوئی دھوپ میں کھیلنے کی عادت تھی۔ گھر والوں کی لاکھ ڈانٹ مار کے باوجود وہ تو میں انارکلی کیلئے نکل جاتا تھا۔ کچھ بڑا ہو جانے کے باوجود موسم سرما میں راوی میں چھلانگ لگانے سے باز نہ آتا تھا۔ بہانہ تو یہی کرتا کہ اس کے ساتھی پکڑ کر لیجاتے تھے لیکن اصل میں وہ ان سب کو گھسیٹ لے جاتا تھا۔ آج آسمان پر دھند چھائی ہوئی تھی۔ حبس غیر معمولی نہ تھا لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے زمین و آسمان میں آگ لگی ہوئی ہے۔ گرمی چاروں طرف پھیلی ہوئی تھی دم گھٹا دینے والا دھواں آسمان پر چھایا ہوا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد وہ چھت پر نوکر سے پلنگ ڈلوا کر لیٹ گیا۔ چاند نکل آیا تھا اور دھند میں ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی حسین دوشیزہ کا چہرہ نیلی اوڑھنی میں لپٹا ہوا ہو۔ وہ چاند کی طرف دیکھتا رہا۔ گھورتا رہا، اور پھر آہستہ آہستہ چاند میں حمیدہ کا چہرہ نظر آنے لگا۔ بڑی بڑی آنکھیں، گھنی بھویں، گول گول چہرہ، نکھرا ہوا

گندمی رنگ، رخسار پر کالا سا تل، موٹے موٹے رس بھرے ہونٹ جیسے سرخ شہتوت، گرم ہوا چلنے لگی اور کثیف بادل کا ٹکڑا چاند پر چھا گیا۔ گو ہوا گرم تھی لیکن پہلے کا جیسا حبس نہ تھا۔ اس نے پائنتی سے چادر اٹھائی اور اوڑھ کر کروٹ بدل لی اور تھوڑی دیر میں گہری نیند سو گیا۔

حمیدہ کے والد کا نام شمشاد علی تھا، وہ ایک عرصے سے دہلی کے سکریٹریٹ میں مترجم کی حیثیت سے ملازم تھے، لاہور اُن کا وطن تھا، لیکن وہ اپنے مختصر سے کنبے کے ساتھ نئی دہلی میں رہتے تھے۔ اور اپنا موروثی گھر جو کسی حویلی سے کم نہ تھا کرایہ پر اٹھائے ہوئے تھے۔ لیکن محرم منانے وہ لاہور ضرور آتے

وہاں سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ساجد کا بنگلہ تھا۔ ساجد کے والد سے ان کے کافی مراسم تھے۔ وہ دونوں لاہور میں شروع ملازمت کے زمانے میں سکریٹریٹ کے ایک ہی ڈیپارٹمنٹ میں تھے۔ ساجد کے والد کے پاس تھوڑی سی جائداد بھی۔ لیکن پھر بھی انھیں ملازمت کرنے میں کوئی عار نہ تھا۔ ساجد حمیدہ کے گھر بچپن سے جایا کرتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ جب حمیدہ جوان ہو گئی اس وقت بھی اس سے پردہ نہ کرایا گیا۔ بچپن کی دوستی شدید محبت میں تبدیل ہو گئی تھی۔ ساجد کے والد کا انتقال ہونے کے بعد قریب قریب روز شمشاد علی صاحب اس کی خیریت معلوم کرنے جایا کرتے تھے۔ اور پھر یہ تعلقات آہستہ آہستہ اور مضبوط ہو گئے۔ یہاں تک کہ ساجد کی والدہ نے حمیدہ کے لئے پیغام بھی دیا۔ اور رشتہ اور بھی مستحکم اور مضبوط ہو گیا۔ حمیدہ نے ابھی ہائی اسکول ہی پاس کیا تھا اور ساجد بھی ایف، اے کے آخری سال میں تھا۔ اس لئے صرف ان کی منگنی ہو کر رہ گئی۔ اس رشتے کے چند ہی ماہ بعد شمشاد علی صاحب کا تبادلہ دہلی ہو گیا۔ منگنی ہونے کی وجہ سے ان کی ملاقاتیں اب کافی مشروط ہوا کرتی تھیں۔ جب وہ ایک دوسرے سے الگ ہو رہے تھے۔ تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ اور آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ آنکھیں کہہ رہی تھیں کہ یہ جدائی عارضی ہے۔ مسکراہٹ غمازی کر رہی تھی کہ اب جب ہم ملیں گے تو ہمیں کوئی نہ الگ کر سکے گا۔ پھر بھی آخری ملاقات میں ساجد نے جب اس کے رس بھرے ہونٹوں کا آخری بوسہ لیا تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔ اور وہ حمیدہ کے دریافت کرنے کے باوجود صرف یہ کہہ سکا "محبت کے آنسو ہیں"

ساجد سو رہا تھا۔ رات بھیگ چلی تھی، کثیف بادل کے ٹکڑے کہیں دور افق میں جا کر چھپ گئے تھے۔ اور خنک ہوا آہستہ آہستہ چل رہی تھی اس نے خواب میں دیکھا جیسے حمیدہ اس کے سامنے سرخ لباس میں ملبوس کھڑی ہے۔ اس سے امداد طلب کر رہی ہے۔ پھر اس نے دیکھا جہاں وہ کھڑی ہے اس کے چاروں طرف آگ لگی ہوئی ہے چھتوں کے چٹخنے کی آوازیں آ رہی ہیں۔ پھر ایک سیاہ مضبوط ہاتھ اس کی ساڑی کی طرف بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ حمیدہ چیختی ہوئی آگ کے شعلوں کی طرف بھاگی اور .... ساجد نے جلدی سے آنکھیں کھول دیں۔ اس کا ہاتھ سینے پر رکھا ہوا تھا۔ دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ اور وہ جلدی جلدی سانس لے رہا تھا۔ پسینے سے اس کی شب خوابی کی قمیص بھیگی ہوئی تھی۔ تھوڑی دیر تک آسمان دیکھتا رہا۔ تارے نرم روی سے چمک رہے تھے۔ اور پھر شہاب ثاقب ایک نقرئی لکیر بناتا ہوا خلا میں غائب ہو گیا۔ اس نے اٹھ کر صراحی سے پانی انڈیل کر پیا۔ اس کے کمرے میں بلب جل رہا تھا جسے نوکر بجھانا بھول گیا تھا۔ وہ آہستہ سے کمرے میں گیا اور روشنی گل کر دی پھر بستر پر آ کر لیٹ گیا۔ وہ تھوڑی دیر سویا ہو گا کہ اسے حمیدہ ایک میلی ساڑی میں نظر آئی اس کے بال چاروں طرف بکھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں سرخی مائل تھیں جیسے ان کا کام صرف رونا ہی ہے۔ اس کے رخسار سوجے ہوئے تھے۔ اور ایک کھنڈر میں اونچی سی دیوار پر کھڑی تھی اس دیوار کے ایک طرف بہت گہری سی خندق تھی۔ دوسری طرف ایک باغ لگا ہوا تھا۔ ایک پیڑ کی شاخ اس دیوار پر رکھی ہوئی تھی ایک آدمی ہاتھ میں چھرا لئے ہوئے اس شاخ سے دیوار پر جانے کی کوشش کر رہا ہے حمیدہ آہستہ سے دیوار پر چلی جا رہی ہے۔ جب وہ آدمی بالکل قریب آ جاتا ہے تو وہ مڑ کر دیکھتی ہے اور زور سے چیخ کر کھائی کی طرف کود جاتی ہے۔ ساجد کی آنکھ کھل گئی۔ اس کے منہ سے رال بہہ کر تکیے پر گر رہی تھی آسمان پر کہیں کہیں تارے نظر آ رہے تھے۔ مسجدوں سے اذان کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی پاس کے مندر سے کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ ساجد خاموشی سے مندر کے کلس کی طرف دیکھنے لگا جو اس کی چھت سے نظر آ رہا تھا۔

....

....

....

....

....

.... پھر وہ آہستہ سے سر تکیے سے لگا کر لیٹ گیا اور خوف زدہ خوابوں کے بارے میں سوچنے لگا۔

دوران اس کے عجیب پریشانی میں گزرے کالج کھلا ہوا تھا لیکن

امتحانات ایک طویل عرصے کے لئے ملتوی ہو گئے تھے۔ وہ دن دن بھر کسی دوست کے ساتھ قہوہ خانے میں بیٹھا موجودہ سیاسی حالات پر باتیں کیا کرتا تھا۔ دوستوں کو جو اپنے کو بہت زیادہ آزاد خیال سمجھتے ان کو اس بات کی ترغیب دیتا کہ وہ اغوا شدہ لڑکیوں سے ہی شادی کریں۔ وہ اکثر زور دے کر کہتا۔ "سوچو تو اگر ہم اپنی قوم کی فلاح و بہبود چاہتے ہیں تو ان کو تباہ ہونے سے بچانا ہمارا فرض ہے۔ ورنہ سب کی سب اڈوں پر جلوہ فگن ہوں گی، عورتوں کے یہ اڈے انسانیت کے سڑتے ہوئے ناسور ہیں"

....

....

....

....

....

.... ساجد دوسرے دن کی شام کا صبح ہی سے منتظر ہو گیا۔ سر شام مال روڈ پر اس نے اکیلے لسی پی اور پھر دفتر کی طرف چل دیا۔ وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا دفتر پہنچ گیا۔ ناظم دفتر نے مسکرا کر اس کے سلام کا جواب دیا اور بولا "کہئے آپ کی کوئی رشتہ دار دہلی کے فسادات میں غائب ہو گئی تھیں" اور اس نے "جی" ہاں کہہ کر ناظم صاحب سے فہرست لے لی۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ ناظم صاحب نے اس کی پریشانی محسوس کرتے ہوئے کہا "گھبرائیے نہیں کرسی پر بیٹھ کر یہ لمبی چوڑی فہرست دیکھئے خدا نے چاہا تو ان کا پتہ ضرور مل جائے گا" اس نے ایک ورق الٹا اور دوسرا ورق بھی اس نے غور سے پڑھا۔ اس نے پہلا صفحہ پھر غور سے پڑھنا شروع کیا۔ جلدی سے اس نے دو ورق الٹ دیئے۔ اور تیسرا صفحہ دیکھنے لگا۔ اس کی نظریں ورق پر دوڑتے دوڑتے رک گئیں جیسے اس کی مطلوبہ چیز مل گئی وہ عجیب کشمکش و رنج کے جذبات میں الجھ گیا۔ اس نے ناظم دفتر سے پوچھا یہ لوگ یہاں کب تک پہنچیں گے؟ "آپ کل دوپہر کو آ کر معلوم کر لیجئے۔ مجھے یہاں تک معلوم ہے کہ یہ سب کل شام کو آ جائیں گی" اس نے شکریہ ادا کرتے ہوئے فہرست واپس کر دی اور سلام کر کے باہر چلا آیا۔

گھر آ کر اس نے ماں کو جب یہ خوشخبری سنائی تو بجائے خوش ہونے کے وہ بگڑ کر بولی "تم بھی افواہوں پر یقین کرتے ہو" "نہیں اماں میں نے خود اس کا نام فہرست میں دیکھا ہے" "کیا اب ہی ایک ہی حمیدہ دنیا میں ہے۔ تو اس کا خیال چھوڑ دے نہ جانے بیچاری زندہ ہے یا نہیں"

اماں تم بھی عجیب ہو دیکھنا جب میں کل اس گھر میں تمہارے سامنے لا کر کھڑا کر دوں گا تب تو مانو گی" "خدا کرے ایسا ہو" اس کی ماں نے اس انداز سے جواب دیا۔ جیسے وہ چاہتی ہو خدا ایسا نہ کرے۔

دوسرے دن وہ ناظم دفتر سے ملنے گیا اور ان سے معلوم کر کے کہ اغوا شدہ لڑکیاں کس کیمپ میں ٹھہرائی گئی ہیں چل دیا۔ کیونکہ کیمپ شہر کے باہر تھا اس نے اس نے مال روڈ پر تانگہ کیا اور روانہ ہو گیا۔ تانگہ ایک گھنٹے تک چلتا رہا اور پھر اسے میدان میں بہت سے خیمے لگے ہوئے نظر آئے۔ وہ تانگے سے اتر کر ایک بڑے سے خیمے کی طرف جانے لگا۔ تو اسے ایک سنتری نے روکا "آپ اگر کسی سے ملنا چاہتے ہیں تو پہلے انکوائری آفس جایئے وہ جو کونے پر نیلا کیمپ ہے" سنتری نے راستہ بتاتے ہوئے کہا۔ جب وہ نیلے کیمپ کا پردہ اٹھا کر اندر داخل ہوا تو وہاں ایک معمر عورت کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی کیمپ کا فرش کچا تھا چند نیم صاف کرسیاں ایک میز کے چاروں طرف رکھی تھیں۔ عورت نے مسکرا کر سلام کا جواب دیا۔

"کہئے آپ کس سے ملنا چاہتے ہیں"!

"میں حمیدہ بنت شمشاد علی سے ملنے آیا ہوں"

عورت نے دراز سے فہرست نکالی اور اس میں دیکھا حمیدہ کس خیمے میں ٹھہری ہوئی ہے۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی گھنٹی کو دبایا۔ گھنٹی کی آواز سن کر ایک آیا اندر آئی "سترہ نمبر خیمے میں جا کر حمیدہ بی بی کو بلا لاؤ" آیا حکم کی تعمیل کرتے چلی گئی۔ ساجد خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر کچھ ایسے آثار تھے جس سے معلوم ہوتا تھا وہ کچھ سوچ رہا ہے۔ کس طرح اس کا خیر مقدم کرے۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ میرے ساتھ جانے پر تیار بھی ہوگی یا نہیں۔ شاید وہ اب احساس کمتری کا شکار ہو کر اپنے کو اس قابل ہی نہ سمجھے کہ وہ میرے ساتھ زندگی گزار سکے۔ پھر اس نے خود ہی اپنے ذہن میں اس خیال کی تردید کی "نہیں نہیں یہ حادثہ ہماری محبت میں حائل نہیں ہو سکتا" عورت کے پوچھنے سے اس کے خیالات کا سلسلہ کٹ گیا "حمیدہ صاحبہ آپ کی بہن ہیں"!

"جی"؟ اس نے جواب دیا جیسے کہ سنا ہی نہ ہو۔ عورت نے پھر اپنا سوال دہرایا۔ وہ ایک لمحے کے لئے کچھ کہتے ہوئے جھجکا۔ پھر اس نے جواب دیا "نہیں وہ میری دور کی بہن ہیں" نوکرانی نے اسی وقت پردہ ہٹا کر کہا "حمیدہ بی بی آ گئی ہیں" "انہیں اندر بلا لاؤ" اس سے پہلے کہ نوکرانی جا کر حمیدہ سے کہے وہ خود پردہ اٹھا کر اندر آ گئی۔

اس کے خشک بال پیلا سوکھا ہوا چہرہ، مرجھائے ہوئے ہونٹ اور بدن پہ میلی ساڑی کو دیکھ کر ساجد کو بھولا بھولا ایک خواب یاد آگیا۔ اس کو دیکھ کر اس کا ذہن نا ماؤف سا ہوگیا۔ حمیدہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ جیسے وہ کہہ رہی ہوں "کیا اب بھی ہم تمہارے ہیں"؟ ساجد گھبراہٹ میں خیر مقدم کے لئے اٹھا ہونٹوں پر مسکراہٹ لانے کی کوشش کی لیکن آنکھوں میں آنسو چھلک آئے حمیدہ خاموشی سے اس کی طرف تک رہی تھی وہ ساجد کو دیکھ کر کسی نتیجے پر نہ پہنچی تھی شاید میری یہ حالت دیکھ کر وہ واپس جانے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ "کہئے آپ کو میرا پتہ ...." وہ اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ معمر عورت بول اٹھی "یہ تمہارے خالہ زاد بھائی ہیں"؟ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ساجد نے عورت سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ رجسٹر لائیے میں دستخط کردوں اور ہم چلیں۔ عورت نے رجسٹر اس کی طرف بڑھا دیا۔ ساجد نے دستخط کئے۔ رجسٹر واپس کرتے ہوئے اس نے دس روپیہ کا ایک نوٹ عورت کو پیش کیا۔

"نہیں نہیں اس کی کوئی ضرورت نہیں"۔ عورت بولی۔ "میں یہاں کی مصیبت زدہ عورتوں کی امداد کے لئے یہ رقم نذر کرتا ہوں"۔ عورت نے مسکراتے ہوئے شکریہ ادا کیا اور ان دونوں کے مل جانے پر مبارکباد دی۔ ساجد حمیدہ کو لے کر تانگے پر گھر کی طرف روانہ ہوگیا۔

ساجد کی ماں حمیدہ کو دیکھ کر دنگ ہوگئیں جیسے وہ کوئی معجزہ دیکھ رہی ہوں۔ انھوں نے مسکراتے ہوئے گلے سے لگایا "بیٹی رونے کی کوئی بات نہیں خدا ہر ایک کے بُرے زمانے کاٹ دیتا ہے"۔ حمیدہ کی آنکھوں میں آنسو لڑیوں میں تبدیل ہوگئے۔ خاموش ہونٹوں سے ہلکی ہلکی سسکیاں نکلنے لگیں "ماں آپ ہی لوگوں کا تو ایک سایہ ہے"۔ یہ کہنے کے بعد اس نے کنکھیوں سے ساجد کی طرف دیکھا جس کی نگاہوں میں مسکراتے ہوئے آنسو تھے اور دو نگاہیں اس پر جمی ہوئی تھیں نہ جانے کیوں وہ شرما گئی۔ اور اس کے کان سرخ ہوگئے۔ حمیدہ نے مختصر طور سے اپنے حالات یوں بتائے آپ تو جانتی ہیں کہ ہم لوگ نئی دہلی میں منٹو روڈ پر رہتے تھے۔ نئی دہلی میں میں نے سُنا ہے کبھی کرفیو نہیں لگا۔ ہمیں گمان بھی نہ تھا کہ اتنا بڑا فساد ہوگا"۔ "فساد نہیں قتل عام" ساجد کی ماں بولی "آبا تو ابھی ہفتے پاکستان آنے والے تھے لیکن ساری آمد و رفت ہی بند ہوگئی تھی رات کے وقت جب ہم لوگ سو رہے تھے ایک دم سے شور و غوغا سنائی دیا۔ اور جب تک ہم لوگ جاگیں لوگ چھتوں سے دیوار پھاند کر آگئے تھے اور پھر کیا

ہوا؟ پھر مجھے لوگ ...." پھر اس کی ہچکیاں بندھ گئیں اور ساجد کی ماں تسلی دیتی ہوئی کہنے لگی "خیر جانے دو ان باتوں کو۔ اب اسی گھر کو اپنا سمجھو"۔ ایک دن حمیدہ نے ساجد اور اس کی ماں کو آپس میں کچھ باتیں اس کے متعلق کرتے سُنا۔ وہ لوگ برآمدے میں بیٹھے اپنی دانست میں آہستہ گفتگو کر رہے تھے۔ کبھی کبھی ساجد زور زور سے بولنے لگتا اور وہ کوئی نہ کوئی فقرہ سُن لیتی۔ وہ اپنے کمرے میں بیٹھی ایک کتاب کی ورق گردانی کر رہی تھی جب اس نے اپنا نام سُنا تو دروازے کی اوٹ سے باتیں سننے لگی۔ ساجد بول رہا تھا "میں سمجھا آپ کیوں نہیں اس کو اپنی بہو بنانا چاہتیں۔ ماں کنوارپن ہی محبت کی دلیل نہیں ہے"۔ یہ کہتے ہوئے اس کی آواز بھرا گئی۔ اس کی ماں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اور تکلی کاتتی رہی۔ جیسے وہ اس دلیل کو نہیں مانتی۔ ساجد نے اپنی ماں کی کمزوری کو اپنے ذہن میں رکھتے ہوئے کہا۔ "اگر ابا جان ہوتے تو آپ دیکھتیں کہ وہ میری آرزو کو کس طرح پورا کرتے"۔ یہ سنتے ہی ساجد کی ماں کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ اس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔ ساجد نے موقع غنیمت جان کر کہنا شروع کیا "ماں اس بیچاری کا ہے کون؟ کیا آپ چاہتی ہیں کہ اپنے بیٹے کی بس ایک ہی خواہش نہ مانیں۔ اور وہ بھی ایسی کہ جس خواہش پر میری ساری مسرتوں کا دار و مدار ہے"۔ وہ یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔ تیر نشانہ پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی ماں کے آنسو نکل آئے تھے۔ اس نے آہستہ سے کہا جیسی تمہاری مرضی۔ ساجد نے اپنی ماں کی پیشانی کو چوم لیا۔ اور خوشی سے اچھلتا ہوا باہر کمرے کی طرف چل دیا۔ حمیدہ یہ فیصلہ سُن کر اوٹ سے ہٹ گئی۔ اس کے پیلے پیلے رخساروں پر سُرخی دوڑنے لگی آنکھوں میں ایک غیر معمولی چمک پیدا ہوگئی جو معصومیت کا اظہار کرتی تھی۔

تھوڑے عرصے کے بعد حمیدہ نئے گرساد کپڑوں میں ملبوس حجلہ عروسی میں کسی کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ شادی کسی خاص اہتمام سے نہ ہوتی تھی بلکہ ساجد نے ظاہری نمائش کے لئے کوئی چیز بھی نہ ہونے دی تھی۔ اس نے اپنے دوستوں کو اک شاندار دعوت دی تھی۔ لو دلہن بہو کے لئے جو کپڑے بنوائے تھے وہ اطلس اور کمخواب کے جوڑے نہ تھے، دوپٹوں میں گنگا جمنی تاروں کے چاند تارے نہ بنے تھے۔ لیکن وہ رنگین تھے۔ نیلے اور گلابی دونوں طرح کے بہو کے لئے کپڑے بنے تھے اس تھوڑے عرصہ میں حمیدہ اتنی جلدی تندرست ہونے لگی تھی جیسے لفظ کوئی صحت کا جادو پھونک دیتا ہے۔ اس کے مرجھائے گلابی

میں زندگی کی سرخی دوڑ گئی تھی۔ اس کی بڑی بڑی حیران آنکھوں میں چمکتی ہوئی آنیوالی رات ...... کی سیاہی بس گئی تھی۔ بجلی کا پنکھا تیزی سے کمرے میں چل رہا تھا۔ حمیدہ کسی کی آہٹ کی بیتابی سے منتظر تھی۔ باہر کے کمرے سے مختلف آوازیں آ رہی تھیں۔ ملے جلے قہقہوں میں وہ اپنا پسندیدہ قہقہہ ضرور پہچان لیتی اور پھر وہ یہی سوچ رہی تھی کہ کہیں وہ جذبۂ ترحم کے ماتحت تو اپنی شادی نہیں کر بیٹھے ہیں۔ یہ لوگوں کیلئے دکھاوا تو نہیں ہے اور وہ اس کی تصدیق یا تردید کے انتظار میں قدموں کی چاپ سننے لگی۔ جو دروازے کے قریب سے آ رہی تھی آہستہ سے دروازہ کھلا۔ اور پھر بند ہو گیا۔ ایک ہاتھ نے آہستہ سے اس کی ٹھوڑی اٹھائی اور جانے کیوں اس کی آنکھوں میں آنسو لرزنے لگے۔ ساجد نے اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا۔ اور پھر ...... چند لمحوں کیلئے جذبات میں ڈوب گئی، جیسے ماضی محض نسیم کا ایک جھونکا تھا۔ بھٹکے ہوئے خیالات دور دھند میں چھپ گئے

تھے۔ حمیدہ کی آنسو بھری آنکھیں جنھیں ساجد نہیں دیکھ سکتا تھا ایک دردناک بیان دے رہی تھیں: "ان پھولوں کی کیا غلطی ہے جو آندھی سے اپنا بچاؤ نہیں کر سکے اور ہواؤں کے خوفناک جھونکے ان کا سب کچھ لوٹ لے گئے۔ لیکن یہ قزاق جھونکے خوشبو کی اس روح کو ہاتھ نہیں لگا سکے ہیں۔ جو پھولوں کی جان ہے۔ اِک میں ہی کیا تمہیں ہزاروں کلیاں سوکھی ...... اور مرجھائی ہوئی ملیں گی لیکن یہ رحم کی نہیں محبت کی مستحق ہیں۔ ان سے محبت کرو، جنھیں حالات کے جبر نے کچلا ہے"۔

اس کے آنسو رخسار سے لرز کر تکیہ پر گر گئے۔ ساجد نے جیسے ستاروں کے گرنے کی آواز سن لی ہو...... حمیدہ کے دونوں بازوں کو دبایا اور کہا۔ میں کتنا خوش قسمت ہوں، آگ اور خون کے سیلاب کو پار کر کے تم مجھے مل گئی ہو۔ اسی طرح شاداب اسی طرح اچھوتی محبت کے ساتھ۔

کلیم نخشب

بچھاؤ پھول جلاؤ دیئے

آسمان کی سانولی پیشانی پر جب پورے چاند سے نورانی سیل پھوٹ نکلا تو وہ ستارے بھی ماند پڑ گئے جو ابھی ابھی تاریک فضا میں مجسّم داغ تھے۔

بجھتے داغوں کی ہنسی اُڑانے کو جب پیڑ کی پتیوں نے تالیاں بجائیں تو آسمان پر زہرہ اور ثریّا نے سمجھا، تا دھن - دھن تنا کی تال ہے بس اب ناچ ڈالو۔ اور پھر کہکشاں کی سجیلی راہ سے ذرا ہٹ کر زہرہ اور ثریّا کا — چاندنی کے نقرئی خلا میں حسین ذرّات کا — اور زمین پر درختوں کے بکھرے ہوئے حسین سایوں کا رقص شروع ہو گیا۔ مکمل حسین متنوّع مگر خموش۔

لیکن جھیل کی بوڑھی پیشانی پر بل پڑ گئے اور پتّیاں بھی تو چیخ اٹھیں جو خزاں۔ کے ہاتھوں پٹ پٹا کر سوکھے کے مریض کی طرح بکھری پڑی تھیں لیکن کچھ پتیاں اپنے ڈر سے اٹھلا کر اٹھیں اور ہوا کے دوش پر سر رکھے جلد سے جلد اور زیادہ سے زیادہ رقص کرتی ہوئی احساسِ ندامت مٹانے لگیں اور جھیل کی بوڑھی پیشانی کی ایک شکن لہر بن کر کنارے کے ریت پر بچھتی، اس کی گود میں سر رکھ کر سوتے ہوتے بچے کے قدم چوم کر ہولے سے واپس چلی گئی۔

بچّے نے جھر جھری لی اور پھر سو گیا۔ وہ بولی "چلو گھر چلیں"۔

میں نے کہا "تمہارا بچّہ بہت خوبصورت ہے —"

"سچ ؟ —"

"ہاں اس کے رنگ میں کاشی کے ساحلوں کی سی صباحت ہے۔ سنگِ اسود کا سا کھنچاؤ ہے۔ تاج کے سے نقوش ہیں، اجنتا کے سے اُبھار ہیں اور تنفّس میں وہ تقدّس بھی تو ہے جو بھجن کے بولوں اور قرآن کی آیتوں میں ہوتا ہے"

وہ خوش ہو گئی۔ بولی "تم شاعری کرتے ہو"

میں بولا "ہاں نثر میں شاعری۔ شبلی نے کہا ہے —"

اس نے بات کاٹ کر کہا "چلو گھر چلیں"

جھیل کے قریب ہی ایک مکان تھا۔ جس کا مالک اسے کرایہ پر اٹھا کر اپنی گذر بسر کرتا تھا۔ اس مکان کے ایک حصّہ میں مَیں شہر کے شور و غوغا سے دُور اپنے ایک ناول میں دیہاتی پس منظر لکھنے کے لئے رکا تھا۔ یہ عورت بھی اس مکان کے ایک حصّے میں رہتی تھی۔ بہت خوبصورت تھی۔ آپ میری کمزوری معاف کریں۔ جانے کیوں یہ جی چاہتا تھا کہ میں اس سے بات کروں۔ بہت کوشش کے باوجود بات "اسمِ شریف" اور "غریب خانہ" سے آگے نہ گئی تھی، آج جبکہ ٹہلتے ٹہلتے وہ جھیل پر ملی تو بس بات یہیں تک ختم۔ دوسرے دن میں منتظر رہا کہ وہ گھر سے باہر نکلے۔ شام کو جب وہ پھر بچّے کو لے کر جھیل پر پہونچی تو میں بھی "اتفاق" سے جا پہونچا۔

اس کے پاس بیٹھتے ہوئے میں نے کہا "ایسا معلوم ہوتا ہے میں نے آپ کو کہیں دیکھا ہے۔ ....."

"— ضرور دیکھا ہو گا" اس نے بات بیچ میں کاٹ دی ورنہ میں تو کہنا چاہتا تھا — میری جان تم اجنبی ہو لیکن نہیں ہو۔ — میں تمکو نہیں جانتا — مگر جانتا ہوں۔ میرا رواں رواں تم سے واقف ہے — تم تو میرے پچھلے جنم کی ساتھی ہو

بولی "میں خود تعجب میں تھی کہ تم جو اس شہر سے ہو مجھے کیونکر نہیں جانتے — مجھے تو وہاں کا بچّہ بچّہ جانتا ہے" پھر لہجہ سوالیہ بنا کر بولی "تم جذبی کو جانتے ہو؟"

"کیوں نہیں —"

"اس نے مجھ پر ایک نظم کہی ہے — چوک سے ترہبنی کے لئے جو سڑک جاتی ہے اس پر داہنی طرف ایک پیپل کا پیڑ ہے۔ وہی جس کے نیچے سرخ رنگ کی کچھ مورتیاں ہیں۔ اس درخت کے ٹھیک بغل میں جو پان والی دکان ہے بس اس کے سامنے جو گلی جاتی ہے وہ میرے زینہ کے دروازے پر آ کر ختم ہوتی ہے —"

"— تم طوائف ہو" میں نے کچھ خوشی اور کچھ گھبراہٹ

میں پوچھا۔

"تھی ——— پر اب نہیں ہوں" میں شرمندہ ہو گیا۔

بچے کو اور اوپر گھسیٹ کر تھپکتے ہوئے بولی "جب تھی ——— اس کے پہلے کبھی نہ تھی ———"

"یعنی؟ ———"

"یعنی یہ کہ صرف ایک لڑکی تھی ——— حالانکہ ایک طوائف کے گھر پیدا ہوئی تھی۔ سر راہ ایک بات سناؤں۔ ماں کہتی تھی میں بڑے اچھے شگون میں پیدا ہوئی تھی۔ صبح سویرے ..... ٹھیک اس وقت میری پہلی آواز فضا میں تحلیل ہو رہی تھی۔ جب گلی کے سامنے پیپل کے درخت کے نیچے ناقوس پھونکا گیا تھا اور نزدیک کی مسجد سے اذان کی آواز بلند کی جا رہی تھی ——— ماں کا کہنا ہے دنیا کی پہلی آواز جو میرے کانوں میں پڑی وہ اللہ اکبر تھی ——— اور میں سوچتی ہوں کتنے گدھے ہیں یہ لوگ۔ جو میری پیدائش کے باوجود بھی گلے کی رگیں تان کر چلاتے ہیں۔ اللہ اکبر ——— خدا بڑا ہے ———"

میں بولا "میں نے سوچا ہے تمہاری باتوں کو اپنی کہانی میں لکھوں گا ——— ایسی باتیں نہ کرو۔ ورنہ میری کہانی ضبط ہو جائے گی۔"

اس نے پوچھا "کیوں! ———"

"اس لئے کہ یہ باتیں تخریبی ہیں"

"اور ان باتوں کی حقیقت تخریبی نہیں ———"

میں نے کہا "——— تم اپنی بات کرو" ———

بولی "بارہ سال کی عمر تک میں نے اپنے جیون کے بارے میں کچھ نہ جانا۔ پھر اس خواہش..... اور ان نظروں کو کیسے سمجھ سکتی تھی جن کا مطلب ہوتا ہے "تم جلد جوان ہو" ——— تیرھویں سال جب میری ماں نے روج اور پاؤڈر کے میل سے میرے چہرے کو اس طرح کا بنا دیا کہ انگارے پر مرمر کے غلاف کا شبہ ہونے لگا تو میں نے جانا کہ کسی نے کموڈ کی ساری گندگی مٹھی میں لے کر میرے چہرے پر تہہ بہ تہہ چڑھا دی ہے کیونکہ تانگہ باہر کھڑا تھا جس پر مجھے چھنو چچا کے ساتھ الفرڈ پارک جانا تھا جہاں امیر زادے ٹہلنے آتے ہیں۔"

"چھنو چچا؟"

بہت شریف آدمی تھے ——— ماں کی زبان میں کہہ رہی ہوں ایک سے ایک مچھلیں پھانس کر لائے مگر معمول سے زیادہ دلالی نہ لی۔ ہم لوگوں کو اپنے گھر والوں کی طرح مانتے تھے بلکہ کون جانے گھر والوں سے بھی زیادہ، کیونکہ ان کے کوئی نہ تھا۔ ہمارے ہی گھر پر رہتے۔ دلالی پیسوں سے افیون کھاتے تھے۔ بس یہی ایک عیب تھا ویسے فرشتہ تھے۔ مجھے اپنی بیٹی کی طرح پیار کرتے تھے ———"

"پیار" میں نے سوچا وہ بات ہی کیا جہاں محبت کا دیوتا نہ براجے "تم نے کسی سے پیار کیا ہے"

کہنے لگی "جب تیرھویں چودھویں میں پہونچی تو چچا نے ماں کو مشورہ دیا کہ بیٹی کو عمدہ قسم کے استاد کی ضرورت ہے اور اس استاد کو جس کی آواز میں سینے کے اندر مقید بلغم کی کھڑک شامل رہا کرتی تھی ہٹا کر ایک بنگالی نوجوان رکھا دیا گیا۔ یہ بنگالی نوجوان ——— جوان تھا ——— خوبصورت تھا۔ لیکن نہ جانے کیوں مجھے اس خوبصورت جلد والی کتاب کی طرح نظر آتا تھا جس کے اوراق کی سیاہی بالکل دھل گئی ہو، ہر صفحہ سادا ہو۔ میں نے سوچا تھا جس طرح مجھے دیکھ کر بوڑھوں ادھیڑوں اور نوجوانوں کی چال میں اکڑ اور چہرے پر ملاحت آجاتی ہے بالکل اسی طرح نہ سہی لیکن کچھ نہ کچھ تو یہ نوجوان چہکے گا ——— لیکن اس کے چہرے پر باوقار سنجیدگی تھی اور کمر کے اوپر کا حصہ کچھ تھوڑا سا آگے کو جھکا ہوا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ پوچھنا چاہا انیل ......"

"انیل ———" میں نے گھبرا کر پوچھا "اس کا نام انیل تھا"

"ہاں، کیوں؟ ———"

"کچھ نہیں ——— آجکل وہ .... کے اوپری مالے پر روپوش ہے"

"پوچھنے لگی "کیوں"!

میں نے کہا "یونہی ——— اپنی سمجھ میں آزادی کے چند جرعے دیکھ کر نہ... صبر کر لینا چاہتا ہے اور نہ... چند لوگوں کو دے دینا چاہتا ہے ——— اور لوگوں کی نظر میں تخریبی ہے"

بولی "پھر لوگ اسے تخریبی کیوں کہتے ہیں"

میں بولا ——— "تم اپنی بات کرو ———"

انیل سے میں نے کئی مرتبہ پوچھا کہ وہ اپنا سر ہمیشہ آگے کو کیوں نیوڑھائے رہتا ہے۔ ایک روز کہنے لگا کہ وہ زمانہ کی شکستوں کی پے بہ پے مار کھا کر آئندہ آنے والے زمانے کو سلام کر رہا ہے اور یہ کہہ کر اپنے گالوں کو جن پر لاپرواہی سے داڑھی اگی ہوئی تھی وائلن پر چپکا دیا۔ یہ اس کی عادت تھی، کوئی اِدھر اُدھر کا سوال ہوا اور اسے وائلن کا سہارا لیا ——— پھر شرما کر بولی "تم مجھے جانے کیا سمجھو اگر میں یہ کہوں کہ جب بھی جتنی بار بھی وہ اپنے گالوں کو وائلن سے چپکاتا میرے روئیں روئیں میں یہ خواہش بیدار ہو جاتی کہ

کاش میں لکڑی کا وہ ٹکڑا ہوتی جسے پالش کرکے ..... کیونکہ میں اس سے محبت کرتی تھی ___ وہ محنت کرکے مجھے نئی نئی دھنیں بتاتا اور میں ان دھنوں کو اسکی اپنی چیز سمجھ کر یادگار کے طور پر دل اور دماغ کے ممی خانے میں پہونچا دیتی۔ سچ کہوں اُس وقت ___ یعنی جسوقت وہ مجھے گانا سکھاتا میں یہ بھی بھول جاتی کہ یہی نے ___ یہی الفاظ جنھیں میں مومیا کر تہہ بہ تہہ رکھتی جاتی ہوں جادو کی ٹوپی کا کام دیں گے جنھیں میں اوڑھ کر سات تالے لگنے والی تجوریوں سے بھی رقم کھینچ لاؤں گی ___ اور جب وہ دوپہر کو ایک گھنٹہ پڑھا کر واپس چلا جاتا تو میں پلنگ پر..... پڑی رویا کرتی اس لئے کہ میں اس سے محبت کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ وہ میرا ہو جائے لیکن جانتی تھی کہ وہ میرا نہیں ہو سکتا ___ لیکن میں نے اس سے کبھی اپنی ہو جانے والی بات کہی بھی تو نہیں ___ دیکھو نا؟ کیسے کہہ سکتی تھی کیونکہ آخر اسی کی اپنی دی ہوئی چیز کو میں سینے سے لگانے کے بجائے اپنی دوکان کا اشتہار بنا رہی تھی ___،، پھر رک کر بولی " میں نے ماں سے ایک روز کہا ماں میں یہ زندگی نہ گذار سکوں گی ___ ماں نے مجھے بتایا کہ بیٹی تو رنڈی کے گھر پیدا ہوئی ہے ___ اور بیٹی سمجھ گئی کہ ایک ماں کی بیٹی ہوتے ہوئے ___ آئندہ آنے والی نسلوں کی ماں ہونے کے باوجود بیٹی رنڈی ہے ___ رنڈی رہے گی کیونکہ ماں رنڈی تھی ___ بھلا تم بتاؤ ایسا کیوں ہوتا ہے۔؟"

میں نے کہا ___" اس کے کوئی باپ نہیں ہے "۔

وہ بولی " مریم بھی تو کنواری تھی ___،،

میں جھنجھلا کر بولا ___" تم اپنی بات کرو ___،،

" اور جب میرا ذہن طوائف پن سے الگ ہٹ کر ہر دروازہ پر دستک دے آیا تو واپس ہو کر صرف ان قہقہوں کو یاد رکھ سکا جو " خطرہ ہے " بن کر ان دروازوں پر چپک گئے تھے جہاں میں نے دستک دی تھی۔ پھر میں نے فیصلہ کر لیا کہ کم از کم انیل کے دروازہ پر تو ان قہقہوں کی خراشیں نہ لگیں گی ___ یہ میری زبردست فتح تھی ___

" پھر ___؟ "

" لیکن جب وہ سر نیوڑھائے میرے سامنے آجاتا تو " وہ رک گئی ___

میں اس کو دانت پیستا ہوا دیکھ کر سمجھ گیا کہ " زبردست فتح " کا احساس چور چور ہونے ہی کے لئے ہو شاید۔

" ایک روز ___ " وہ بولی " میں نے اس سے پوچھا کہ آپ دیپک راگ جانتے ہیں۔ وہ ہنسا۔ سامنے کے دانت دیپک ایسے جل اٹھے ___ کہنے لگا۔ بات بہت پرانی ہے جانے سچ بھی ہے۔ لو ایک اور دھن سنو ___ میرے روئیں روئیں میں ایک بار پھر خواہش بیدار ہونے لگی کہ کاش ___ اے کاش۔ اس نے اپنے گال وائلن سے چپکا دئے اور جب تار سے تار رگڑے ___ تو انیل ___ خوبصورت انیل ذرہ ذرہ ہو کر فضا میں تحلیل ہو گیا ___

دیواروں نے اپنی جگہ چھوڑ دی ایسا معلوم ہوا کہ میرے پیروں تلے فرش ہے ہی نہیں۔ میں... موسیقی کے ریشمی ڈوروں میں الجھی خلا میں بے ہاتھ پاؤں ہلائے بے حس و حرکت ٹنگی ہوں ___ ایک عجیب سا احساس ___ ایک عجیب سی لذت۔ عجیب سی کشش۔ ___ جو شاید شاہجہاں کے اس ایک لمحہ سے بھی بڑی تھی جس میں اس نے " تاج " کا سپن دیکھا تھا ___ اور جس طرح پانی پڑنے کے فوراً بعد چاندنی نکل آئے اور تاج کے گنبد پر بارش کی ڈھلکتی ہوئی بوند اپنے اندر روپہلی شمعیں چرا لے ٹھیک اسی طرح جب اسکی لے آسمان کو چھونے لگی، میرے تمام آنسو جنھیں میں آج تک پیتی رہی تھی دیئے بن کر جل اٹھے، لے ختم ہو گئی ___ ذرات سمٹے انیل مجسم سامنے آگیا۔ دیواریں اپنی جگہ لوٹ کر جم گئیں پیروں کو فرش کا احساس ہونے لگا ___ البتہ میرے اندر کے تمام دیئے اسی طرح جلتے رہے ___ میں نے انیل سے کہا یہ تو سچ مچ دیپک راگ تھا ___،، رک گئی

میں نے دیکھا کہ آنکھوں میں پچھلے طوفان کا نقش اجاگر ہو رہا ہے

___" پھر؟ ___ "

کہنے لگی " اس نے کہا نہیں۔۔ اور مسکرا دیا ___ لیکن میں کہتی ہوں یہ دیپک راگ تھا۔ ایسا راگ جس سے جلائی ہوئی دیپک کی لویں پھر شاید کبھی نہیں بجھتیں ___ دیپک کی ایک ایک لو پتھر کی لکیر ہے۔ انیل تمہیں مل جائے تو کہنا کہ میرے اندر ان پتھر کی لکیروں کا ایک جال سا ہے ___ لیکن میں مجبور تھی ___ تم یہ نہ سمجھو کہ میں سماج کے میگھ راگ کا ڈر لے بیٹھی۔ وہ کیا جانے میگھ راگ ___ اس کے راگ میں تو آندھی طوفان اور بگولے ہیں جو میری دیپ شکھا کو نقصان نہیں پہونچا سکتے۔ ہاں اس کا ڈر ضرور تھا کہ اگر یہ آندھی طوفان اور بگولے میری لوؤں سے ایک چنگاری بھی چرا کر تمہارے جیون کو پھونک دیں تو پھر کیا ہوگا۔ اسی لئے میں نے

اپنے دیپکوں کی لَوؤں کو اندر گھسیٹ کر چھوٹا کر لیا ــ اسی لئے میں نے تم پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں تم سے محبّت کرتی ہوں۔ یہاں تک کہ ایک دن تم چلے بھی گئے ــــ آہ انیل"

پھر تھوڑی دیر تک چپ رہنے کے بعد خود ہی بولی" ادھر چھنّو چچا اپنی بیٹی کے لئے دن رات کی دوڑ دھوپ میں سرگرداں تھے۔ مجھے الفرڈ پارک میں ٹہلایا گیا۔ نمائش میں بلاوجہ گھمایا گیا صرّافوں کی دُکانوں پر ناک کی کیلیں پسند کرانے لے جایا گیا اور پھر آخر کو چھنّو چچا نے ایک روز ہنس کر ماں کے کان میں کچھ کہہ ہی دیا۔ میں صرف اتنا سُن سکی" دو ہزار روپئے ــــ" اور پھر ساری رسمیں ادا کرنے کے بعد کمرے میں بیٹھی ہوئی پرانی طوائفوں کے سامنے میری نتھ کو اتار کر پھول اور بتاشے بھرے تھال میں رکھ کر پھیرا گیا تاکہ وہ مجھے دعائیں دیں۔ ویسی ہی دعائیں جیسی ہندو سیٹھ گنیش اور پاروتی کی مورتیوں کو طاق پر رکھ کر طاق کے دونوں طرف سرخ رنگ سے لکھ دیتے ہیں" شبھ لابھ" ــــ اور پھر مجھے اتنا یاد ہے کہ مہین جھریوں کی بھیڑ کے اوپر سرخ آنکھیں تھیں اور نیچے دبی دبی مسکراہٹ ــــ آنکھیں جن میں فرعون کے اُس تیر کا خون تھا جو خدا کو زخمی کرنے کا ثبوت دیتا تھا اور مسکراہٹ کہ ــ تم کہو تو سجدہ بھی کر لوں ــ اور جب میں صبح کمرے سے باہر نکلی تو چھنّو چچا برآمدے میں دیوار سے پیٹھ لگائے اونگھ رہے تھے جھوم رہے تھے کیونکہ وہ فرشتہ تھے۔ کیونکہ وہ مجھے بیٹی کی طرح مانتے تھے ــــ کیونکہ وہ اپنی بیٹی کے لئے دو ہزار روپئے کا تحفہ لائے تھے۔ میں نے چچا کے سامنے رکھی ہوئی کٹوری کو دیکھ کر سوچا کہ یہ شخص کتنی ہی عصمتوں کو اس کٹوری میں گھول کر پی گیا ہوگا۔ کمبخت ذلیل کمینے ــــ تھوڑی میں نے غلیظ گالیاں بکنی شروع کر دیں لیکن میری طبیعت سیر نہ ہوئی۔ میں نے اس کے منہ پر تھوک دیا وہ جھومتا رہا ــ جوتی اتار کر سر پر رسید کر دی وہ گنگناتا رہا ــ وہی الفاظ جو بیٹی کے وداعی گیت میں ہوتے ہیں"

اور پھر اس کے بعد میں نے تیزی سے ناچنا گانا شروع کر دیا جیسے جی کو تشفّی مل گئی ہو۔ جانے کیوں جب انیل کی دھنوں کو جادو کی پڑیاں بنا کر اتنی بہت سی رقمیں سامنے گروالیتی تو ایک گونہ خوشی ہوتی ــــ میں محسوس کرتی کہ اس سماج کو زک دینے میں انیل میرے ساتھ ہے ــــ مجھے جیسے اپنے پیشے سے اطمینان ہو گیا ہو، لیکن کبھی کبھی میرے پیشے کی پہلی رات اور اس کے بعد کی تمام راتیں میرے دل میں ایک مسلسل چبھن کا احساس اُجاگر کر دیتیں۔ میں تلملا اُٹھتی ــــ مجھے ایک چیز کی ضرورت محسوس ہوتی، بدلہ ــــ اور ایک دن جب میں اپنے آنے والے احساس کے طوفان کو دبائے اپنی کھڑکی کے سامنے .... کھڑی تھی۔ میں نے انیل کو دو سپاہیوں کے ہمراہ ہتکڑی میں جاتے دیکھا، لوگ کامریڈ انیل زندہ باد کے نعرے لگا رہے تھے ــــ اس واقعہ اور میرے احساس سے کوئی ناتا نہیں ہونا چاہیئے۔ لیکن ہوا۔ میں نے سوچا کہ اگر انیل میرا ہوتا تو وہ آج یوں۔ لیکن وہ میرا کیوں نہیں ہو سکا۔ میرا ذہن" خطرہ ہے" کا پھاڑا لے کر پھر بدلہ کی طرف مڑ گیا ــ میری چبھن کا احساس دیپک راگ سے روشن دئیوں کی روشنی میں جگمگا اُٹھا ــــ بدلہ ــ بدلہ ــــ لیکن یہ تقاضہ یہ احساس تو دن کو تھا ــــ دن ــ جب سماج ہم سے کوسوں دُور اور الگ ہوتا ہے۔ میں بغیر کسی ارادے کے اندر کوٹھڑی چھنّو چچا بیٹھے تھے۔ میں ان کی طرف بڑھی۔ میرے ہاتھ ان کی گردن کی طرف بڑھے۔ جی چاہا کہ گلا گھونٹ دوں لیکن ماں نے آ کر مجھے پکڑ لیا ــــ اور پھر اس کے بعد بدلے نے صرف ایک خواہش کا روپ دھار لیا کہ کاش چچا مر جائے" پھر رُک کر بولی ــ" لیکن میرے احساس کی چبھن کو تسکین نہ ہوئی۔ یہ اور بات ہے کہ میں اپنے پیشے میں اور تندہی سے جٹ گئی۔ ایک روز کا واقعہ ہے سینما سے تانگہ پر گھر واپس آ رہی تھی تانگہ والا تیز ہنکالتے ہوئے بولا چل بیٹا جلدی آج انعام ملا تو ــــ میرا نام لے کر بولا ــ اس کے یہاں جائیں گے۔ میں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میری تجارت اپنے کمال کو پہونچ گئی تھی۔ گو اس کمال تک پہونچانے میں میری ذاتی محنت کا ہاتھ تھا۔ میری باتوں سے تم نے سمجھ لیا ہوگا کہ مجھے اس پیشے سے نفرت تھی لیکن میں کیا کرتی ــــ میں نے کئی بار سوچا کہ اس پیشے کو چھوڑ ہی دوں چاہے بھیک ہی کیوں نہ مانگنی پڑے، لیکن ان ہاتھوں کو بھی تو نہ بھول سکی جو سنسان گلی میں سخی بن کر میرے ہاتھ پر پیسہ رکھنے کے بعد مجھے اندر گھسیٹ لیں گے۔ اسی لئے پیشے سے یہ نفرت ایک عادت بن گئی اور یہ عادت ایک معمول ــــ اور پھر اگر اب بھی کبھی میری یہ نفرت معمول سے بڑھ جاتی تو جی خودکشی کو چاہتا تھا۔ لیکن میرے اندر کے تمام دئیوں کی ہر لَو سے ایک چھوٹ جیسی پیدا ہوتی میرے دل و دماغ سے ہر چھوٹ کا عکس ہٹتا اور مجھے بہروں سمجھاتا۔ کیا سمجھاتا یہ میں خود نہیں جانتی۔ کیونکہ مجھے

انیل کا انتظار نہ تھا ـــــ کیونکہ میں انیل کے دروازہ پر دستک نہ دے سکتی تھی۔ کیونکہ میری لَویں انیل کو بھسم کر سکتی تھیں۔ پھر کیا سمجھاتی میں خود نہیں جانتی۔ ہاں اتنا یاد پڑتا ہے کہ دل کا ذرہ ذرہ ہمک ہمک کر کہہ اٹھتا ـــــ ہم انیل سے محبت کرتے ہیں ـــــ اور دماغ کی اس دلیل نے بھی کچھ نہ کچھ زندہ رہنے کے لئے سمجھایا کہ نتھ اتر جانے سے کیا ہوتا ہے۔ .... میری عصمت تو اَب بھی محفوظ ہے۔ تم مجھے احمق نہ سمجھو یہ زندہ رہنے کے کیلئے ایک بہانہ نہ تھا۔ اس پر مجھے اب بھی یقین ہے۔ تم خود سوچو ہماری عصمت اور تمہاری عصمت میں بڑا فرق ہے دونوں کو ایک پیمانے سے نہ ناپو، ہماری عصمت کا معیار وہ نہیں ہے جو تمہارا سماج بنا دے۔ ـــــ تمہارا مذہب، تمہارا اخلاق، تمہاری روزمرہ کی زندگی اسکی گواہ ہے کہ مجبوریاں ہر چیز میں لچک پیدا کر دیتی ہیں پھر ہماری دنیا جو ہماری مجبوری ہے ہماری عصمت کا پیمانہ کیوں نہ الگ بنائے۔ غور کرو کیا میری عصمت محفوظ نہ تھی۔ میں قسم کھا کر کہہ سکتی ہوں جوانی کا مزہ کسے کہتے ہیں یہ میں نے نہ جانا۔ پھر عصمت کی تاراجی میں نہیں سمجھتی ـــــ "پھر گھبرا گئی جیسے کوئی غلط بات کہہ گئی ہو ـــــ" میری عصمت کے برقرار رہنے کے ثبوت میں صرف اتنا سمجھو کہ ہماری عصمت کا پیمانہ الگ ہے۔ کیونکہ جب میرے شہر میں آزادی کے دن قریب آئے تو ہندو مسلم ...... یہ ہندو مسلم فساد بھلا کیوں ....، ہوتا ہے"۔

میں نے کہا "دونوں اپنے مذہب کی حفاظت کرتے ہیں"۔

بولی "نقصان کون پہونچاتا ہے"؟

بتایا کہ "دوسرے مذہب کے غنڈے"

کہنے لگی "ایک تو غنڈے پھر دوسرے دھرم کے۔ بھلا نقصان کیوں کر پہونچ سکتا ہے ـــــ؟"

میں نے کہا "ـــــ تم اپنی بات کرو" ـــــ

جانے کہاں سے، جانے کیوں یہ فساد پھوٹا تھا ـــــ تم بھی مجھے انسانیت سے دور نہ سمجھو تو ایک بات بتاؤں۔ جب یہ فساد شروع ہوا تو جیسا انسانی طبیعت کا تقاضہ ہے ـــــ یہ گہری بات مجھے تمہارے سماج کے ایک آدمی نے بتائی تھی ـــــ کسی ایک طرف ہو جانے کو جی چاہا۔ لیکن اپنے بیتے دنوں پر نظر ڈالی تو وہاں میری گلی کے سامنے پیپل کے درخت کے نیچے سرخ مورتیاں ہیں اور اس طرف مسجد سے اذان بلند ہو رہی ہے۔ میں پریشان تھی کہ میں کیا ہوں۔ ہندو ہوں کہ مسلمان ـــــ لیکن میں فیصلہ نہ کر سکی۔ میں نے انیل کا قول یاد کیا کہ ہندو اور مسلمان سے الگ ایک اور قوم ہوتی ہے "انسان" ـــــ لیکن جیسا کہ کسی ایک طرف ہو جانے والی گہری بات چاہتی تھی میں وہ بھی تو نہ تھی ـــــ کیونکہ میں کسی طرف نہ ہو سکی ـــــ ہاں ـــــ میں نے اس فساد کو ایک نئی طرح سے دیکھا۔ یہ میری دکانداری کو نقصان پہونچا رہا تھا۔ لوگوں کو کرفیو کی وجہ سے میرے گھر آنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ میری تو خیر کوئی بات نہیں۔ لیکن وہ جو ہندو اور مسلمان اور انسان سے الگ میری قوم والیاں نانبائی کے یہاں سے روٹی اور گوشت منگوا کر کھایا کرتی تھیں بھوکوں مرنے لگیں۔ ایک روز ـــــ" پھر نئے سرے سے بات شروع کرتی ہوئی بولی "انسان ایک بیوی۔ ایک گھر۔ ایک طرح اور ایک ہی رفتار سے گھبرا جاتا ہے کیونکہ وہ ترقی پسند ہے ـــــ اور اس ترقی پسندی پر دن بھر میں صرف چار چھ واردات۔ توبہ ہے ـــــ کب تک یہ انسان اس پر بس کرتے۔ مسجد سے اٹھتی ہوئی اللہ اکبر کی آواز میں "نعرۂ تکبیر" بھی شامل ہو گیا اور پیپل کے نیچے بجتی ہوئی آرتیوں کی گھنٹیوں میں چھریوں کی جھنکار مل گئی ـــــ لوگ جتھا بنا کر نکل پڑے کہ آج برسیں گے اور روز برسیں گے۔ ہر محلے میں وارداتیں ہوئیں اور آخر ایک دن ـــــ" پچھلا سلسلہ ملاتے ہوئے بولی" ـــــ ایک دن کتوں کی یہ ٹولی ہمارے محلے کی طرف بڑھی۔ کچھ نوجوان میرے کوٹھے پر چڑھ آئے۔ جب کوٹھے پر چڑھنے کی آواز ہوئی تو چھنو چچا کھٹ سے دروازے کی طرف پیشوائی کے لئے بڑھتے۔ وہ آج بھی بڑھے۔ ان لوگوں نے سمجھا کہ وہ روک کرنے آیا ہے، ایک چھری سینے میں اتر گئی اور ـــــ آئیے حضور ـــــ تشریف لائیے ـــــ وہ آئیں گھر میں ہمارے ...... حلق میں اٹک کر رہ گئے۔ تم کہو گے مجھے تو خوش ہونا چاہیئے کہ میری خواہش کہ "کاش چچا مر جائے" پوری ہو گئی۔ میں کہتی ہوں تم اپنے بستر کی سفید چادر کو کیا کموڈ صاف کرنے والی جھاڑو سے صاف کرو گے ـــــ اگر میرا بس چلتا تو میں ان کے منہ پر تھوک دیتی جوتی سر پر توڑ دیتی اور پھر بھی اگر وہ لوگ دھرم کی افیم میں جھومتے تو ـــــ تو انھیں بتا دیتی کہ ارے کمبختو! اسے جو تم نے مارا ہے یہ تمہارا بھائی ہے۔ اسے اٹھا کر گلے لگا لو ـــــ اسے اپنے اس نیک کام کا کہ جو تم مجھے لوٹنے آئے ہو ساتھی سمجھو۔ کیونکہ یہ تو مجھے پہلے ہی لوٹ چکا ہے۔ میری سات پشتوں میری سات نسلوں کو لوٹ چکا ہے"۔ ـــــ اور اگر اب بھی وہ لوگ دھرم کی لیئو میں میرے انیل کی بتائی ہوئی انسانیت کے لئے بدائی گاتے رہتے تو ـــــ تو ان کا گلا گھونٹ

دیتی —— "کچھ سوچتی ہوئی بولی ——، میں سوچتی ہوں اگر یہی تمہارا دھرم ہے تو کچھ نہیں ہے" وہ میرا جواب پانے کے لئے رک سی گئی۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا۔

اس نے دوبارہ کہنا شروع کیا " پھر تھوڑی دیر بعد —— اسی حالت میں کہ مجھے کوئی لطف نہ حاصل ہوا تھا لیکن جانے مجھے کیوں یہ محسوس ہوا کہ آج میری عصمت لُٹ گئی ہے۔ میں نہیں سمجھا سکتی کہ میں نے ایسا کیوں سوچا۔ لیکن اس بات کا یقین تھا کہ وہ عصمت جو آجتک بچی رہی تھی، اب محفوظ نہیں۔ تم شاید سمجھتے ہو کہ مجھے اس بات کا دکھ رہا ہوگا کہ انھوں نے میری ماں کو مار ڈالا۔ میری دولت لوٹ لی۔ لیکن یقین کرو ایسا کوئی دکھ نہ تھا۔ تم شاید یہ کہو گے کہ میری اجرت نہ دی اس کا دکھ ہے —— میں کہوں گی تم گدھے ہو۔ تم سمجھ نہیں سکتے ... کہ انھوں نے مجھے اپنا روپ دیا۔ اپنی شبیہ دی کہ میں اسے پال پوس کر بڑا کروں اور پھر سامنے کھڑا کرکے اس میں ان لوگوں کے خدوخال دیکھوں۔ پھر اس چہرے پر —— یعنی اس خدوخال پر —— یعنی" ان "پر تھوک دوں، جوتیاں سر پر توڑ دوں اور گلا گھونٹ دوں —— اور پھر میرے بدلے کی چبھن کا احساس کم ہو جائے۔ چار روز تک اسی طرح، اسی جگہ اپنی عصمت کے لٹنے کا احساس لے کر۔ بدلے کی چبھن میں کمی کی امید لے کر پڑی رہی ——" یکایک اس کا لہجہ شدت سے نرم پڑ گیا ——" لیکن جب بچہ پیدا ہوا تو وہی وقت تھا کہ مسجد سے اذان بلند ہو —— پیپل کے نیچے سے ناقوس بج اٹھے —— جانے یہ سب ہوا کہ نہ ہوا مجھے تو صرف اتنا یاد ہے کہ مشرق کی گود میں سرخ شفق بڑی حسین تھی۔ بہت ہی حسین ——" پھر کچھ رک کر بولی ——" اور اب میں اپنا پیشہ چھوڑ کر اپنا گھر چھوڑ کر یہاں اس جگہ آگئی ہوں —— بچے کو سینے سے لگاتے ہوئے بولی " میرے دل میں اب بدلہ کی چبھن کا کوئی احساس نہیں ہے۔ کیونکہ اسمیں وہ خدوخال نہیں۔ اس کا ایک ایک نقش، ایک ایک بال —— دیپک راگ نے تراشا ہے —— یہ ناقوس و اذان نہیں سرخ شفق ہے —— —— یہ میرا بچہ ہے "

تو میں نے بچے کا مذہب جاننے کے لئے پوچھا " اس کا نام —— ؟"

اس نے گویا سُنا نہیں۔ کہنے لگی " تم نے اس بچے کے لئے کیا کہا تھا —— تمہارا بچہ بہت حسین ہے —— ؟"

—— میں بھی اسی کے ساتھ بولنے لگا " اس کے رنگ میں کاشی کے ساحلوں کی سی صباحت۔ سنگِ اسود کا سا کھنچاؤ ہے، تاج کے سے نقش ہیں، اجنتا کے سے اُبھار ہیں —— اور سانسوں میں وہ پوترتا بھی تو ہے جو تمہاری نظروں (میں نے ہچکچا کر کہہ ہی دیا " تمہاری نظروں میں ") بھجن کے بول اور قرآن کی آیتوں میں ہوتا ہے۔

کہنے لگی " اور بس اس کے آگے اس بچے کا کچھ نہیں۔ نہ نام نہ گاؤں —— نہ ملک نہ مذہب "

میں نے کہا " تو اسے ایک بوسیدہ کپڑے کا جوڑا دیکر بھوکا اور پیاسا وہاں چھپا دو جہاں زندگی کے نشانات تک مٹ چکے ہوں —— نہیں تو میرے لوگ اس پر چاندماری کریں گے ——"

بولی " وہ دیکھو جھیل کی بوڑھی پیشانی پر بل پڑ گئے ہیں۔ چند مری ہوئی بوسیدہ پتیاں اپنے ڈر سے اٹھلا کر اٹھیں ہیں اور ایک خونی ..... ناچ ناچ کر اپنی بچی کھچی زندگی سے جلدی سے جلدی۔ زیادہ سے زیادہ نمی نچوڑ لینا چاہتی ہیں۔ لیکن ان پر اعتبار نہ کرو ساتھی —— یہ پتیاں مردہ ہیں۔ وہاں دیکھو جہاں پتیاں تالی بجا کر مجھے بڑھاوا دے رہی ہیں۔ یہ پتیاں عوام ہیں —— وہ اس طرف روشنی دیکھ کر تم خوش ہو گئے ہو گے۔ تم نے سمجھا ہو گا کہ سویرا ہو گیا۔ ارے احمق سویرا نہیں۔ یہ تو تیری دنیا کی چند سفیدیوں کی ایک چھوٹ ہے۔ چھوٹ پر اعتبار نہ کر —— چھوٹ سراب ہے۔ اپنے پیاسوں پر رحم کھا۔ سراب کی طرف نہ دیکھ —— ادھر دیکھ —— یہ میرا بچہ ہے۔ نہ نام۔ نہ گاؤں۔ نہ ملک۔ نہ مذہب —— یہ سرخ شفق ہے "

جواں دماغ ڈائرکٹر ایم صادق کی شخصی نگرانی میں
ڈائرکٹر ایم ظہور کا نادر و معجز نما تحفہ
نغمات کی ملکہ ثریا کے رومانی جاذبِ توجہ کارنامے
شانتا
افسانہ و مکالمے:۔ ایم ظہور
موسیقی:۔ پنڈت حسن لال بھگت رام
تفصیلات کیلئے لکھئے
سینٹرل انڈیا پکچرز، شری ساؤنڈ اسٹوڈیوز، دادر بمبئی
تقسیم کنندگان:۔
دہلی، یوپی، مشرقی پنجاب۔ جگت ٹاکیز ڈسٹری بیوٹرز، بمبئی نمبر ۱۴
مغربی پنجاب (پاکستان) سندھ و بلوچستان۔ تحسین پکچرز۔ لاہور

بشمبر ناتھ

اگلی منزل

دھوپ کی حرّت کم ہو چکی تھی۔ ....
اور کناٹ پلیس جاگنے لگا تھا۔ سجے سجائے سٹال نیلے پیلے اور سپید برقی قمقموں سے جگمگانے لگے تھے۔ دکانوں نے باہیں پھیلا دی تھیں۔

خریدار، تماشہ بین، سیّاح، جیب کترے، بابو، افسر، بوڑھے، بچّے، مرد عورت سبھی منوّر اسٹالوں کا طواف کر رہے تھے۔ جیسے شہد کی مکھیاں اپنے چھتوں پر بھنبھناتی ہوں۔ پورب اقدپچھم سے، دکشن اور اُتّر سے۔ یہاں سے وہاں سے لوگوں کا ایک اتھاہ ساگر اُمڈتا چلا آرہا تھا۔ قہوہ خانے اور ریستوران اٹے پڑے تھے۔ کلب اور ناچ گھر سے پائل اور گھنگھروؤں کی جھنکار شیریں وکیف آور نغموں سے دلوں میں ایک ہیجان پیدا کر رہی تھیں، رنگ محلوں اور شراب خانوں میں اندر سبھا کا رنگ جم چکا تھا۔ جہاں ایک سے ایک حسین اپسرا، ایک سے ایک دلربا رقاصہ ایک سے ایک بڑھ ماتی مینکا دیوتوں کے دل ٹھمک ٹھمک کر، تھرک تھرک کر، کولھے مٹکا مٹکا کر برما رہی تھیں اور دیوتا انبساط وجوانی کے نشے میں چور ان کے قدموں میں آنکھیں بچھا رہے تھے۔ یہ دلی ہے ——— آزاد ہندوستان کا پایۂ تخت اور کناٹ پلیس کی شام رنگین دلّی کے تعیش پسندوں کا ملجا وماوا!

بس سٹاپ پر ہانپتی کانپتی نمبر ۹ کی گاڑی کھڑی ہوگئی مسافر دھکّے دیتے اور دھکّے کھاتے ہوئے بس سے باہر کود پڑے اور کوئی ادھر کوئی اُدھر انسانوں کے بے پناہ ریلے میں گم ہوگئے۔ ڈرائیور اور کنڈکٹر ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیئے پاس والے "کاکے دا ہوٹل" میں گرم گرم کباب سے شغل فرمانے لگے اور کنڈکٹر نے مُڑتے ہوئے، ایک مسافر سے کہا "بس پندرہ ۱۵ منٹ کے بعد جائے گی ——— جی ہاں لودھی روڈ"

"چاچے دی ہٹی" سے ایک نووارد کا آرڈر دُھر لیتے ہوئے ایک چھوکرا چلّا اٹھا:-

"چار پلیٹ کوفتہ۔ چار پلیٹ شکار ——— دو پلیٹ روغن جوش لگانا جی،" اور ہوٹل والوں کے خوانچے گرم گرم چڑی ہوئی روٹیوں کے انبار سے۔ قلیہ، قیمہ، سیخ اور شامی سے اَٹ چکے تھے اور ادھر مسافر خالی بس میں داخل ہوتے جا رہے تھے۔ اگلی منزل پر جانے کے لئے۔

بوڑھے، بچّے، جوان، مرد اور عورتیں سبھی اگلی منزل پر جانے کے لئے گاڑی میں سوار ہو رہی تھیں، "یہ نشست عورتوں کے لئے ریزرو ہے"، ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے ایک طالب علم کو زنانہ نشست سے اٹھاتے ہوئے کہا۔ طالب علم بڑبڑا کر پچھلی ایک نشست پر جم کر بیٹھ گیا۔ کچھ رنگین طبیعت نوجوان دھکم پیل سے کام لے کر زنانہ نشست کی عقبی نشستوں پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ لیکن زنانہ نشستوں پر جمی ہوئی ایک ادھیڑ عمر کی لالائین، ایک کالی کلوٹی مدراسن اور ایک پوپلے مُنہ والی بڑھیا کے بغیر ان کی پیاسی نظروں کی تشنگی بجھانے کا کوئی سامان میسّر نہیں تھا۔ نوجوان مایوس نگاہوں سے کھڑکیوں میں سے باہر جھانک رہے تھے اور قریب و دُور کی لہراتی ہوئی ساڑھیوں، ریشمیں غراروں، اور ترّاق شلواروں کی بہار لوٹ رہے تھے۔ مسافر پر مسافر گاڑی میں گھستا رہا اور ہر بار رنگین مزاجوں کی نظریں مایوس ہو کر پلٹ جاتیں۔ جانے آج نمبر ۹ سے حسن بھاگ کیوں رہا تھا۔ اور پھر ایک نوجوان جوڑا اٹھکھیلیاں کرتا ہوا چہچہاتا چمکتا بس میں داخل ہو گیا۔

نوجوان تو خیر ایک پچھلی مردانہ نشست پر جا بیٹھا اور اس کی دلرُبا ساتھن مے برساتی ہوئی۔ چمکتی مہکتی فضا میں ایک سرسراہٹ پیدا کرتی ہوئی اگلی زنانہ نشست پر جا بیٹھی۔ مسافروں میں ایک حرکت سی پیدا ہوگئی۔ رنگین مزاج نشستوں پر تن کر بیٹھ گئے۔

کھڑکیوں سے جھانکنے کے بدلے اب نووارد حسینہ کے عطر بار گیسو، اس کے بھرے بھرے شانے، اس کی مرمریں باہیں، اس کے کانوں میں جھکتے ہوئے بُندے اس کی بہار بداماں ساڑھی کے بہاؤ اور اس کے اُبھرتے ہوئے مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں، جیسے باہر کا سارا حسن سمٹ کر عشق کے قریب تر آکر اگلی نشست پر بیٹھ گیا ہو۔ اور مسافروں

کو عجب شانِ استغنیٰ سے دعوتِ نظارہ دے رہا ہو۔

"بی بی صاحبہ اس ننھے بچے کا باپ نہیں ہے۔ دو دن سے کچھ نہیں کھایا بیچارے نے۔ بھگوان کے لئے چار پیسے کی بھیک دو۔ داتا آپ کا بھلا کرے۔"

لرزتی ہوئی آواز میں ایک بھکارن نے اپنے روتے بلکتے نحیف و نزار بچے کو پیش کرتے ہوئے کہا۔ اور ملتجیانہ نظروں کے ساتھ مسافروں کے مرکزِ تصور الہڑ حسینہ کے سامنے اپنا ہاتھ دراز کیا۔ اس کا بچہ سٹر سٹر ناک بہا رہا تھا۔ اس کے نتھنوں پر میل کی کئی کئی تہیں جم گئی تھیں، اس کے عریاں بدن پر اڑتے ...... ہوئے گرد و غبار میں اس کی انتڑیاں گنی جا سکتی تھیں۔ اور بھکارن کے میلے دوپٹے، جابجا پیوند لگی ہوئی کالی شلوار اور پھٹی پرانی قمیص سے ایک پریشان کرنے والی سڑاند کے بھبکے نکل رہے تھے۔ حسینہ کے چمکیلے کپڑوں اس کے دمکتے ہوئے گالوں، اس کے چکا چوند پیدا کرنے والے آویزوں اور اس کے خوشنما گندھے ہوئے بالوں کو دیکھتے ہی ایکا ایکی بچے نے بلکنا بسورنا بند کر دیا۔ اور اپنے معصوم مگر میلے اور سڑاند میں لبے ہوئے ہاتھ حسینہ کی طرف پھیلانے لگا۔ معصومیت بھی حسن پر مچل گئی تھی شاید ـــ!

حسینہ نے ایک سرسری نظر سے پہلے بچے کو اور پھر اس کی آشفتہ خاطر جوان ماں کو دیکھا۔ کچھ سوچا اور پھر منہ موڑ کر اپنے ہینڈ بیگ کیساتھ، ساڑھی کے آنچل کیساتھ اور پھر اپنے کلائی باز و بند کیساتھ معصومیت کیساتھ کھیلنے لگی۔

بھکارن قریب تر سرک گئی اور اپنا کانپتا ہوا ہاتھ پسارتے ہوئے پھر ملتجی ہوئی: "بی بی صاحب بھگوان آپ کا بھلا کرے اس بچے کا باپ نہیں ہے۔ دو دن سے بھوکا ہے۔

بھگوان کے نام پر چار پیسے ......" بچہ اب بھی خاموش تھا۔ جیسے کاکے دا ہوٹل اور چاچے کی ہٹی کے سارے خوان۔ ساری ضیافتیں اور روٹیوں کے انبار اس کو مل گئے تھے۔ اب اس کا معصوم ہاتھ حسینہ کی خوبصورت اور منقش ساڑھی کے آنچل کے قریب پہنچ رہا تھا۔ اور اس کے سڑاند میں لبے ہوئے ہاتھوں کی۔ اس کی ماں کے بدبودار چیتھڑوں کی عفونت بس میں داخل ہو رہی تھی۔ حسینہ کا دماغ اس بساند سے پریشان ہو رہا تھا۔ اس نے رومال سے ناک اور منہ ڈھک لیا۔ اور سر کو ایک خفیف حرکت دیتے ہوئے ایک دھیمے سُر میں بولی

ـــ "معاف کرو بی بی ـــ دیا کرو"

پچھلی نشست پر بیٹھے ہوئے نوجوان نے بھکارن سے حسینہ کو چھٹکارا دینا اپنا مذہبی فریضہ تصور کرتے ہوئے آنکھیں لال پیلی کر لیں اور حسینہ کی ترجمانی کرتے ہوئے کڑک کر بولا۔

"معاف بھی کرو خدا کے لئے۔ کیوں جان کھائے جا رہی ہے"

لیکن بھکارن گئی نہیں۔ اس کی انتڑیاں ایک بے ہنگم ساز بجا رہی تھیں۔ اس کا بچہ دو دن سے بھوکا تھا۔ کیسے جا سکتی تھی وہ۔ اور قریب آکر پھر حسینہ کی توجہ اپنی طرف۔ اپنے بھوکے ننگے بچے کی طرف، اپنی عریانی کی طرف، اپنی پیوند لگی ہوئی شلوار کی طرف کھینچنے کی سعی کرنے لگی۔ "بی بی صاحبہ تم آپ بڑی اچھی ہیں۔ میرا بچہ بھوکا ہے۔ اس بچے کا باپ نہیں ہے ...." اور اب بھوکے ننگے بچے کا گندہ ہاتھ حسینہ کے آنچل سے کھیل رہا تھا۔ نہایت اطمینان کیساتھ ـــ خوش ہو ہو کر جیسے اسے ساری کائنات کی نعمتیں.. مل گئی ہوں۔ معصوم بچے کے میلے ہاتھ کا لمس محسوس ہوتے ہی حسینہ لال انگارہ ہو گئی۔ اس کے شاداب ماتھے پر بل پڑ گئے۔ اس کے متبسم چہرے پر خشونت، غصہ اور قہر کے آثار نمودار ہو گئے۔ اور اپنے آنچل کو ایک شدید جھٹکے کے ساتھ چھڑاتے ہوئے اس نے ترشی اور درشتی کیساتھ بھکارن کو ڈانٹنا شروع کر دیا:

"بخشش بھی دو شریف زادی۔ کیوں جان کا روگ بنتی جا رہی ہے۔ کوئی کام دھندا کیوں نہیں کرتی۔ مفت خوری کہیں کی۔ ہٹ ادھر"

بھکارن سہم گئی۔ اور چار قدم ہٹ کر۔ بایاں ہاتھ پسارے کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ بچہ پھر بلک بلک کر رونے لگا۔ جیسے کسی نے اس کی جنت چھین لی ہو۔ حسینہ پہلو بدل کر بیٹھ گئی۔ رومال اب بھی اس کے دماغ پر مضبوطی کیساتھ جما ہوا تھا۔ عقب میں بیٹھا ہوا جوان اب نئے نئے زاویوں سے حسینہ کے خدوخال کی سیر کر رہا تھا اور لمحہ بہ لمحہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا جا رہا تھا۔ سندھی ہوٹل کا بوائے (BOY) آرڈر لے کر چلایا ـــ

تین پلیٹ مرغا ـــ تین پلیٹ پلاؤ ـــ

تین پلیٹ روغن جوش لگا نا جی

بھکارن اور اس کے بھوکے بچے کے پیٹ کی آگ پھر تیز ہو اٹھی، بچہ زور زور سے چیخنے لگا۔ بھوکی ماں کے گرد سے اٹے ہوئے بال نوچنے لگا۔ اس کی خشک چھاتیوں پر تھپڑ جھاڑنے لگا ـــ اور اپنا ہاتھ بار بار پاس کے ہوٹلوں پر سجے ہوئے روٹی کے انباروں۔ بھرے بھرے ہوئے خوانچوں اور لذیذ و مرغن نعمتوں کی طرف لپکا رہا تھا۔

اور ماں ــــــ انتہائی بے بسی کیساتھ اپنے بچے کو چمکارتی پچکارتی بس کی کھڑکیوں کا طواف کر رہی تھی۔ ہر کھڑکی پر ہاتھ پسارتی جاتی تھی۔ ہر مسافر کے سامنے اپنا دکھڑا روتی، گڑگڑاتی، خوشامدیں کرتی، آنسو بہاتی ہوئی اپنا سوال دہراتی گئی۔ مگر بے سود، لا حاصل، بے اثر، ہر بار اس کا پسرا ہوا ہاتھ مایوس ہو کر نیچے گرتا۔ ہر کھڑکی سے اس پر فقرے کسے جاتے نصیحتیں سنائی جاتیں۔

"کام دھندا ڈھونڈھ کوئی پیشہ اختیار کرو۔ تمہیں بھیک مانگتے حیا نہیں آتی ــــ!!"

بھکارن بس کے دروازے پر آ پہنچی تھی۔ ایک پنجابی بابو اپنا ہیٹ گھماتے ہوئے سب سے پچھلی نشست پر بیٹھا بس کے سٹارٹ ہونے کا بے صبری سے انتظار کر رہا تھا۔ بھکارن آگے بڑھی۔ اس کے قیمتی کوٹ کے دامن کو جھٹکتے ہوئے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"بابو صاحب۔ اس بچے کا باپ نہیں ہے۔ دو دن سے بھوکا ہے بچارا۔ دیا کرو۔ بھگوان کے لئے چار پیسے کی بھیک دو۔"

بابو صاحب پھنکارنے لگے۔ کوٹ کے دامن کو جھٹکے کے ساتھ چھڑا لیا۔ جیسے کسی کالی ناگن سے دامن بچانے کی سعی کر رہے ہوں۔ اور پھر گرجتے ہوئے بولے۔

"جا جا شیطان کی خالہ۔ سر پر چڑھی آتی ہے۔ تمہارے بچے کا ٹھیکہ تھوڑے ہی لے رکھا ہے ہم نے۔ کیوں جنے تھے تم نے بچے؟"

اور پھر پہلو میں بیٹھے ہوئے مسافر کی طرف مخاطب ہو کر بابو صاحب تجسم سے مدعم پر آ کر بولے۔ "نو سینس ہے بھائی صاحب یک لخت نو سینس۔"

دوسرے مسافر نے اپنی توند کو سہلاتے ہوئے تائید میں سر ہلا دیا۔ اور ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے بولا۔

اور پھر حکومت بھی ان کو لائسنس دے چکی ہے۔ کوئی گلی نہیں کوئی کوچہ نہیں جہاں اس نامراد نسل کے افراد دندناتے نہ ملیں۔ بھلا کس کس کو کھلایا جائے۔

تیسرے مسافر نے ــــــ جو اب تک سامنے کی نشست پر بیٹھی ہوئی حسینہ کی زلفوں کے پیچ و خم میں الجھا ہوا تھا ــــــ چونک کر کہا۔

"چھوکریوں کو تو سوانگ بھرنے آتے ہیں۔ نہیں تو ایسے تن و توش والی چھوکری سے کوئی کام دھندا نہیں ہو سکتا تھا کیا؟

بابو صاحب پھر بول اٹھے۔

بھیک بھی مانگتی ہے اور وہ بھی ہاتھی پر سوار ہو کر۔ ایسے طمطراق اور دبدبہ دار الفاظ میں تقاضے ہوتے ہیں۔ جیسے ان کے دادا جان کا قرضہ چکانا باقی ہو۔ دیکھا نہیں آپ نے کس بے باکی سے جھنجھوڑنے لگی ــــــ کم ذات!

ایک کھدر پوش مسافر نے اپنی نوکیلی گاندھی ٹوپی سے پنکھے کا کام لیتے ہوئے بائیں آنکھ میچ لی اور بابو صاحب سے مخاطب ہوا۔

بابو صاحب! چھوکری معمولی بھکارن تھوڑے ہی ہے۔ کہ دور سے التجا کرتی۔ یہ تو آپ کی خالی اسامی کے لئے مناسب امیدوار درخواستیں طلب کر رہی تھی۔

بس کے مسافروں نے ایک فرمائشی قہقہہ بلند کیا۔

اگلی نشست پر بیٹھی ہوئی سال خوردہ عورتوں نے ڈوپٹوں کے آنچل کھینچ لئے اور حسین و جمیل دوشیزہ کے گالوں کی سرخی کنپٹیوں تک بکھر گئی۔

بھکارن دو گز پیچھے ہٹ کر کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ مجوب اور مبہوت نگاہوں سے وہ مسافروں کو تک رہی تھی۔ اسے شاید یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ یہ سب لوگ انسان ہیں، پہلو میں دل اور دل میں تڑپ رکھنے والے انسان۔ اسے شاید یقین نہیں آ رہا تھا۔ کہ یہ۔

ہندوستانی ہیں۔ بھکارن کے ہم وطن، ہم مذہب، اپنے رشتے کے بھائی۔

مسافروں کی پھبتیاں اور کھدر پوش کے فقرے اس کے دماغ پر ہتھوڑے چلا رہے تھے۔ اس کا پھیلا ہوا ہاتھ خود بخود گر گیا۔ ہاتھ کے بدن سے ایک تھرتھری چھوٹ گئی۔ اس کا عضو عضو دکھنے لگا۔ ٹانگیں لڑکھڑانے لگیں اور اس کا بچہ زور زور سے چیخنے لگا۔ ہوٹل کی طرف دونوں ہاتھ پھیلا کر لپکنے لگا۔

جگو دلال اب بھی اپنی گھنی بھوری مونچھوں کو برابر مروڑے جا رہا تھا لیکن اب اس کی نگاہیں اگلی نشست والی حسینہ کے شانوں سے ہٹ کر بھکارن پر جم چکی تھیں۔ وہ اس کے خد و خال کا باریک بینی کیساتھ جائزہ لے رہا تھا۔ بھکارن کے گرد میں اٹے ہوئے بال، میلے دوپٹے میں ڈھکا ہوا سڈول جسم، سینے کا ابھار، کمر کی لچک، اعضاء کا تناسب، اس کی موٹی موٹی آنکھیں، ستواں ناک، جگو کو سنجیدگی کیساتھ سوچنے کی دعوت دے رہی تھی۔

جگو کی نگاہوں کے سامنے نئے زاویئے اُبھرنے لگے۔ نئی توسیں کھنچ گئیں۔ نئے حلقے بندھ گئے اور جانے کیوں اس کے بے رونق چہرے پر ایک چمک ایک شادابی تیرنے لگی۔ پلک جھپکائے بغیر وہ بھوت بھکارن کو دیکھتا رہا۔ اس کے رنگ ڈھنگ کو تو لتا رہا۔ مول تول کرتا رہا۔ اور تصور ہی تصور میں اُس نے بھکارن کو جی۔ بی۔ روڈ کے آراستہ بالاخانے پر جلوہ گر کر دیا۔ نفیس نفیس کپڑے پہنا کر، تصور ہی تصور میں اس نے بھکارن کے پریشان اور گرد آلود بالوں کو سنوارا۔ اس کی زلفیں درست کیں۔ ان میں تیل ڈالا، عطر ملا۔ اس کے بدن کو مکلف غذاؤں سے حسن گم گشتہ سے پھر نکھارا غازہ اور پاؤڈر سے لیپا پوتا، بھکارن کے کانوں میں جھمکے آویزاں کر دیئے۔ کلائیوں کو چھنکتی ہوئی چوڑیوں سے سجایا گلے میں طلائی ستلڑی ڈال دی۔ پاؤں میں پایل باندھ دیئے۔ آنکھیں کاجل کی لکیر سے چمکا دیں اور پھر ایک حسین دلھن بنا کر اسے بالاخانے کے ایک اونچے ایوان میں بٹھا دیا۔ نیلے پیلے اور سرخ وسپید برقی قمقموں کی ہلکی ہلکی روشنی سے اس کے حسن کو دوبالا کر دیا۔

جگو سوچتا گیا —— انہماک کے ساتھ —— سر ہلا ہلا کر انگلیوں کو مٹکا مٹکا کر۔ اس کے چہرے کا رنگ لحظہ بلحظہ تبدیل ہو رہا تھا۔ جیسے وہ بھکارن سے کہہ رہا ہو۔

لاجو —— تم جوان ہو اور سندر۔ قدرت نے تمہیں حسن بخشا ہے، بھیک مانگنے کے لئے نہیں، مٹی میں کھونے کے لئے نہیں، حسن بھیک نہیں مانگتا۔ مٹی سے نہیں کھیلتا، ہاتھ نہیں پھیلاتا، فقرے نہیں سہتا۔

کب تک یونہی اپنی جوانی برباد کرتی رہو گی۔ کب تک اپنے لال کو بلکتے دیکھ سکو گی۔ کب تک ذلتیں سہتی رہو گی —— لاجو —— تم حسین ہو۔ خاک میں لتھڑا ہوا ایک گلاب —— آؤ تمہیں فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دوں۔ اپنے کھوئے منصب پر —— وہاں جہاں یہ پنجابی بابو —— یہ کھدر پوش —— یہ توند والے سیٹھ تمہارے قدموں پر آنکھیں بچھائیں۔ تیرے اشاروں پر ناچیں۔ جہاں تمہارا منا بھوک سے نہ بلکے۔ تمہاری جوانی ان ملگجے چیتھڑوں کی جھانکیوں سے نہ جھانکے۔ جہاں تم پر پھبتیاں کسنے کی کسی میں ہمت نہ ہو۔ ہاں لاجو —— ایک رنگین دنیا —— ایک حسین دنیا باہیں پھیلا پھیلا کر تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ ہمت سے کام لو، قدم بڑھاؤ ایک کروٹ میں وہ حسین و رنگین دنیا تمہارے قدم لینے دوڑے گی۔

کیا سوچ رہی ہو لاجو —— تمہارا بچہ دو دن سے بھوکا ہے سایوں کے پیچھے دوڑنا —— چھایا کو پکڑنے کی کوشش کرنا —— پتھر کے مجسموں سے رحم کی درخواست کرنا اور پھر بھوکے ننگے رہنا —— یہ بھی کوئی جیون ہے لاجو۔

"قدم بڑھاؤ —— اگلی منزل کی طرف —— حسین دنیا کی طرف —— اپنے بھوکے لال کے لئے سہی"

اور جیسے لاجو کی بھوت تصویر بے بسی سے۔ با دلِ ناخواستہ، جھجک جھجک کر آگے بڑھنے لگی۔ لرزتے ہوئے پیروں سے۔ اور بچہ دو دن کا بھوکا بچہ جانے کیوں مسکرا اٹھا۔ جیسے اسے باپ مل گئے ہوں شفیق و مہربان باپ —— کما کما کر لانے والے باپ —— جو اپنے عزیز کو کبھی بھوکوں رہنے نہیں دیں گے۔

دُور کیپیٹل میں گھنٹی بجی، ناچ شروع ہو رہا تھا۔

"ہوتا نہیں برباد کوئی اپنی خوشی سے"

کا نغمہ ہوا میں گونجنے لگا۔

بس کنڈکٹر ٹکٹ کاٹ رہا تھا۔ اگلی منزل پر جانے والے مسافروں کے لئے۔

اور جگو ایک جست لگا کر —— تیزی کے ساتھ بس سے اتر آیا۔ جیسے بھیڑیا شکار پر جھپٹ رہا ہو۔

رباعی

جلتی ہوئی شمعوں کو بجھانے والے
جیتا نہیں چھوڑیں گے زمانے والے
لاشِ دہلی پہ لکھنؤ نے یہ کہا
اب ہم بھی ہیں کچھ روز میں آنے والے

جوش ملیح آبادی

راما نند ساگر

وہ ایک لمحہ

وہ ایک لمحہ
جب میں نے تمہیں اپنے اس قدر قریب محسوس کیا
اُس لمحے کو یاد کر کے میں اب بھی ایک سنسنی سی محسوس کرتا ہوں

میں تمہیں دیکھ نہ سکا - چھو نہیں پایا
محض تمہارے قرب کو محسوس کر سکا
اپنے قریب - بہت قریب
یوں
جیسے ایک اندھے کے قریب سے
خوشبوؤں کے رتھ پر ایک دیوی گزر جائے
اور قریب سے گزرتے وقت اس کی ساری کا پلّو
ہوا میں ایک ہلکی سی ہلور پیدا کر گیا ہو
اور ہوا کا وہ ہلکا سا معطر جھونکا اندھے کے پھیلے ہوئے ہاتھوں سے مس کرتا ہوا نکل جائے
میں نے بھی - کچھ اسی طرح
اس ایک لمحے میں تمہیں اپنے قریب محسوس کیا

ہائے وہ ایک لمحہ
بلکہ ایک لمحہ سے بھی تھوڑی مدّت
جو اُڑتی ہوئی خوشبو کی طرح
شروع ہونے سے پہلے وقت کے لامحدود تسلسل میں تحلیل ہو گیا
گویا وہ وقت کا ایک مادّی ذرّہ بھی نہ تھا
بلکہ محض وقت کا ایک احساس سا تھا
وہ ایک لمحے بھر کی مدّت
جب تمہارا ابدی سانس میرے ایک فانی سانس کی رگوں میں سما گیا تھا
جب میرے ہاتھ میں پکڑا ہوا قلم تمہارے کسی ان دیکھے ہاتھ کے تابع ہو گیا تھا
—— اور مجھے اچانک محسوس ہوا
کہ میں نہیں لکھ رہا - بلکہ کوئی اور ہے جو پسِ پردہ تار ہلا رہا ہے

ماہنامہ ایشیا - جولائی ۱۹۴۹ء

گویا میں نے تمہیں احکامات جاری کرتے ہوئے روبرو پکڑ لیا تھا
پھر جانے کب تم نے اس ڈرامے میں میرے ہی قلم سے یہ فقرہ لکھوا دیا کہ
"پیار ایک وشواس کا نام ہے — انسان کی نیکی پر یقین کرنے کا نام محبت ہے"
یہ ایک سندیس — ایک عظیم پیغام
کسی بنیادی حقیقت کی مظہر یہ ایک الہامی تفسیر
جو اس قدر یقین سے کہی گئی کہ میں خود حیران ہو گیا۔
کیونکہ ابھی تک اس قدر پختہ یقین سے کچھ کہنے کی اہلیت میں اپنے میں نہیں پاتا

ہائے۔ اس لمحے بھر میں کیا کچھ ہو گیا
اور وہ لمحہ ابھی تک کس طرح زندہ ہے
گویا وہ ماضی نہیں بنا۔ ابھی تک حال ہے
اور مستقبل میں بھی حال ہی رہے گا
یوں معلوم ہوتا ہے۔
کہ وہ ایک لمحہ اس وقت کا حصہ نہ تھا
جو ہر گھڑی، ہر پل ماضی کی طرف بھاگتا ہوا ختم ہو جاتا ہے
بلکہ وہ ابد و ازل کا ایک ٹکڑا تھا
جو اب بھی زندہ ہے
اور ایک ابدی مستقبل کی طرح ہمیشہ زندہ رہے گا
گویا تمہارے ایک ان دیکھے لمس نے اس کے حال کو دوام بخش دیا ہے

یوں محسوس ہوتا ہے
کہ میرے قلم کی نوک پر ایسے پیغام رکھ کر
تم میرے ذمہ بھی کوئی کام ڈال رہے ہو
میں — جو ایک کھلنڈرے بچے کی طرح راستے کے کنارے اِدھر اُدھر کھیلتا پھر رہا تھا
جو آج تک کسی بھی راستے کی طرف کوئی واضح اشارہ نہ کر سکتا تھا
اب تم میرے کندھوں پر بھی راہنمائی کا بوجھ ڈال رہے ہو
اتنے برسوں آرٹ کی خدمت اور ریاضت کا شائد یہی صلہ ہے
کہ ذمہ داریوں کا بوجھ بڑھ رہا ہے
اور اس بوجھل احساس نے میری شوخئ طبع کو کند کر دیا ہے

یہ تم سے کیسا ملن ہوا ہے
جس میں اُچھل کود اور شوخی — کچھ بھی نہیں
صرف ہے ایک بوجھل سی سنجیدگی

یا ایک درد ___ جو پھیل کر سارے جہان کا درد ہوا جا رہا ہے -
اس ایک لمحے کی قربت کے عوض
کتنی بڑی قیمت وصول کر رہے ہو تم ___ سوداگر کہیں کے!

لیکن ___
قرب کے ایسے ہی ایک اور لمحے کے لئے
محض اس احساس کی سنسنی کے لئے
میں پھر اتنی ہی بڑی قیمت ادا کرنے کو تیار ہوں -
اور اسی کے انتظار میں
میں زندگی بھر اسی طرح لکھتا رہوں گا

سرشار صدیقی

بس آج کی رات

بکھیر دی ہیں گھٹاؤں نے سرمئی زلفیں — جوان سینوں کے آنچل فضا میں لہرائے
صراحی کھول، پیالہ اٹھا، شراب پلا! — وہ دیکھ سانولے بادل فضا میں لہرائے

یہ بوندیاں ہیں کہ چنگاریاں ہیں اے ساقی — سلگ اٹھی ہے مری شاعری کی بزمِ خیال
یہ آگ آگ کے شعلوں سے سرد ہوتی ہے — انڈیل دے مرے ساغر میں آتشِ سیال

یہ خلوتیں، یہ پُراسرار چاندنی یہ بہار — عروسِ شب کی جوانی گذر نہ جائے کہیں
ابھی شباب پہ ہے کیفِ زندگی اے دوست — پلا، پلا - کہ یہ نشہ اتر نہ جائے کہیں

ابھی سے زیست مجھے اجنبی سی لگتی ہے — نصیب ہوں کہ نہ ہوں ایسے دن خدا معلوم
کسے خبر کہ یہ رات آخری ہو پینے کی — پھر آئے بھی کہ نہ آئے یہ رات کیا معلوم؟

نرگس
آپ کی پسندیدہ اداکارہ
نرگس آرٹ کنسرن کی المیہ تصویر
داروغہ جی
میں
جے راج ۔ مصرا ۔ نیلم ۔ راج رانی ۔ ابوبکر ۔ نثار ۔ ریکھا اور رشید کے ساتھ
کہانی و مکالمے :۔ بائی جدن بائی
گانے :۔ منوہر کھنہ
پروڈیوسر :۔ انور حسین
ڈائرکٹر :۔ اختر حسین
یاد رکھیئے :۔ ہندوستان بھر کے تقسیم کاروں کا فیصلہ ہے کہ "داروغہ جی" سالِ رواں کی بہترین تصویر ہے
نرگس آرٹ کنسرن ۔ فیمس سنے بلڈنگ، ہینس روڈ، بمبئی نمبر ۱۱
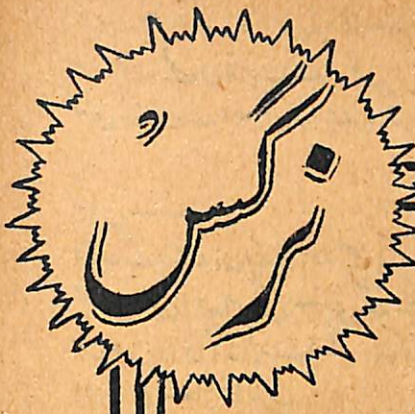
آسکر وائلڈ

ترجمہ: شکیل اختر

خضرِ راہ

رات کا وقت تھا اور وہ تنہا تھا۔

اس نے بہت دور سے شہر کی دیواروں کو دیکھا اور اسی طرف چل کھڑا ہوا۔ جیسے جیسے وہ شہر سے نزدیک ہوتا گیا خوشی اور غم کے ملے جلے نغمے اسے سنائی دینے لگے۔ قہقہوں کی دلآویز آوازیں اور نفیری کی مدھ بھری تانیں اس کو محو کرنے لگیں۔ اس نے شہر کے دروازے کو کھٹکھٹایا اور دربان نے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔

اور اس نے سنگ مرمر کی بنی ہوئی ایک عمارت کو دیکھا۔ جس کے آگے سنگ مرمر کے ستون کھڑے تھے۔ عمارت کے اندر اور باہر صنوبری مشعلیں روشن تھیں آخر وہ اس عمارت کے اندر داخل ہو گیا۔

جب وہ زبرجد کے بنے ہوئے ہال سے گزرا اور کھانے کے کمرہ میں پہنچا تو اس نے ایک شخص کو سرخ مخملی صوفے پر دراز پایا۔ اس شخص کے سر پر سرخ گلابوں کا تاج تھا۔ اور اس کے لبوں سے شراب کا ہلکا گلابی رنگ چھلک رہا تھا۔

وہ اس شخص کے پیچھے گیا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ "تم اس طرح زندگی کیوں گزارتے ہو؟"

اس شخص نے سر اٹھا کر دیکھا اور اس کو پہچان لیا۔ اس نے جواب دیا۔ "میں ایک جذامی تھا مگر تو نے مجھے اچھا کر دیا، اب میں زندگی اس طرح نہ گذاروں تو کیا کروں!" وہ گھر سے باہر نکل آیا اور سڑک پر چلنے لگا۔

اور اس نے ایک عورت کو دیکھا جو رنگین کپڑوں میں ملبوس تھی، اس کے چہرہ پر غازہ لگا ہوا تھا اور اس کے پاؤں میں موتیوں کی پازیب تھی۔ اس کے پیچھے شکاریوں کی طرح چپکے چپکے ایک نوجوان آیا جو دو رنگ کا لبادہ پہنے ہوئے تھا۔ اسے دیکھ کر اس عورت کا خوبصورت چہرہ ایک مرمریں بت کی طرح دمکنے لگا اور نوجوان کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

اس نے تیزی سے بڑھ کر اس نوجوان کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا "تم اس عورت پر ہوسناک نگاہیں کیوں ڈالتے ہو"؟

نوجوان نے اپنے سر کو حرکت دی اور اس کو پہچان لیا۔ اس نے جواب دیا۔ "میں اندھا تھا مگر تو نے مجھے آنکھیں دیں اب میں اس عورت کو نہیں تو پھر کس کو دیکھوں"؟

اور آگے دوڑ کر اس نے عورت کے رنگین دامن کو پکڑ لیا اور کہا "کیا گناہ کی راہ سے ہٹ کر تم دوسری راہ اختیار نہیں کر سکتیں"؟

اس عورت نے گھوم کر دیکھا اور اس کو پہچان لیا۔ اس نے جواب دیا میں تو گنہگار تھی مگر تو نے میرے گناہ معاف کر دیئے اور گناہ کی راہ سب راہوں سے حسین ہے" اور وہ شہر سے باہر نکل آیا۔

جب وہ شہر سے باہر آیا تو اس نے ایک نوجوان کو سڑک کے کنارے روتے ہوئے دیکھا وہ اس کی طرف گیا اور اس کے لمبے لہراتے ہوئے بالوں کو چھو کر پوچھا "تم کیوں رو رہے ہو"؟

نوجوان نے سر اٹھا کر دیکھا اور اس کو پہچان لیا اس نے کہا۔

"میں مر گیا تھا، مگر تو نے زندہ کر دیا اب میں اپنی قسمت پر آنسو نہ بہاؤں تو کیا کروں"

رُباعی

دِل بیکسیٔ ادب پہ تھرّاتا ہے
بے کیف فضا میں دم گھٹا جاتا ہے
فردوسی و رودکی سمجھتا ہوں اُسے
مصرع بھی مرا جو آج دُہراتا ہے

جوشؔ ملیح آبادی

سیفی بک مینوفیکچرنگ ڈپو
لیٹر بک، رائٹنگ پیڈ، نوٹ پیپر
اکسرسائز بک، نوٹ بک، ڈپلیکیٹ بک
اور
ہر قسم کی اسٹیشنری کے
ہول سیل اور ریٹیل
کیلئے
ہماری خدمات حاصل کر کے
فائدہ اٹھائیے
سیفی بک مینوفیکچرنگ ڈپو۔ ۷۲ عبدالرحمان اسٹریٹ بمبئی ۳

CUCKOO IN "ANDAZ"
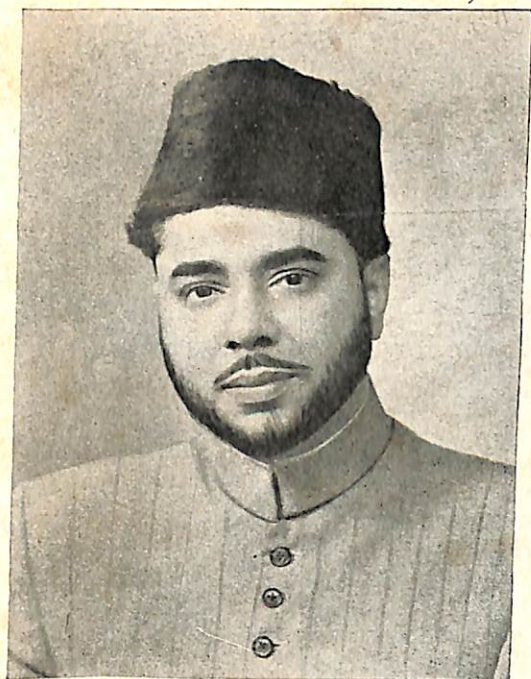
NAZAR SEHOORVI

HAFIZ MOHD. SADDIQ
Cawnpori.

سیّدہ فرحت

غزل

لُطف اب حُسنِ تخیّل سے اُٹھا سکتی نہیں
خود فریبی میں بھی اب تسکین پا سکتی نہیں

ہم نشیں ہیں روز افزوں زندگی کی تلخیاں
گیت اب میٹھے رسیلے گُنگنا سکتی نہیں

ہر طرف سے گھیرتا جاتا ہے طوفانِ حیات
میں جو چاہوں بھی تو اب دامن بچا سکتی نہیں

جب کہ ہر لمحہ ہے احساسِ غمِ دوراں سوا
میں غمِ جاناں کے افسانے سُنا سکتی نہیں

زندگی کی دُکھ بھری آواز ہے پیہم بلند
لَے اب ان گیتوں کی بھی اس کو دبا سکتی نہیں

مجھ کو حاصل تھا کبھی رونے میں بھی کیف و سرور
خوش دلی سے آج لیکن مسکرا سکتی نہیں

تا بہ کے سرمایۂ و محنت میں یہ جنگ و جدال
فطرتِ انسان اب اسکی تاب لا سکتی نہیں

بر سرِ میداں نظر آتے ہیں مزدور و کسان
کوئی طاقت اب اُنھیں پیچھے ہٹا سکتی نہیں

اب مساوات و اخوّت کا علَم اُونچا کرو
سر بلندی آدمیّت ورنہ پا سکتی نہیں

جوشؔ ملیح آبادی

پھیر دے کعبہ و کاشی کی عناں

اے ساقی

تشنۂ خوں ہے پھر آئینِ جہاں اے ساقی — پھر صراحی سے اُنڈیل آبِ مغاں اے ساقی

ہاں اُٹھا جام کہ پھر فضلِ خداوندی سے — دہر ہے کار گہہ فتنہ گراں اے ساقی

للہ الحمد کہ اب خونِ محبت کے عوض — آتشِ بغض ہے رگ رگ میں رواں اے ساقی

اس نئے دور کے قدسی صفت انسانوں میں — آدمیّت کا نہیں نام ونشاں اے ساقی

کھول میخانہ کہ انساں کی جواں بختی سے — پھر مقفّل ہے درِ امن واماں اے ساقی

جن سے کل شہرۂ آفاق تھی اپنی محفل — اب وہ انداز وہ آداب کہاں اے ساقی

آج ہم دیکھ رہے ہیں جیسے گھبرائے ہوئے — کبھی دیکھا تھا کسی نے یہ سماں اے ساقی

پوچھتا ہوں یہ ترے قول کا ابطال نہیں — عالمِ پیر ہے کیا اب بھی جواں اے ساقی

اپنے میخانۂ اخلاص کی جانب للہ — پھیر دے کعبہ وکاشی کی عناں اے ساقی

غرق کر دے مئے گلرنگ میں سینوں کا غبار — ہر نظر ہے تری جانب نگراں اے ساقی

جسکو دیووں کے سوا کوئی سمجھ ہی نہ سکے — زیرِ مشق اب ہے وہ اندازِ بیاں اے ساقی

جس کے ہر لفظ میں سَو پھول مہک اٹھتے تھے — کاٹ دی جائے گی شاید وہ زباں اے ساقی

ٹھیکرے بیچنے والوں کے پُرانے گاہک — بند کرتے ہیں جواہر کی دکاں اے ساقی

برہمن شور کرے شیخِ زماں چنگھاڑے — اور مستوں پہ ہو شورش کا گماں اے ساقی

جھونک دے آتشِ بیباک میں مستوں کی شراب — اور جگر میں پڑے آبِ رواں اے ساقی

تیر برسائیں دلِ خلق پہ ناقوس و اذاں — اور کڑکے سرِ قُلقُل پہ کماں اے ساقی

پنڈت و پیر کریں جنگ و جدل کی تلقین — اور معتوب ہوں رندانِ جہاں اے ساقی

کیا قیامت ہے کہ ہو کوثر و گنگا میں فساد — تیغ ہو گردنِ صہبا پہ رواں اے ساقی

سانس روکے ہوئے بیٹھا ہے سیہ خانے میں
جوش سا نغمہ گر و زمزمہ خواں اے ساقی

جعفر علی خاں اثر لکھنوی

غزل

ہجومِ نالہ و ہنگامۂ فغاں لے کر
چلا ہے اے دلِ ناداں مجھے کہاں لیکر

کبھی تو سُن لے کہ لکھا ہے ہیں نے افسانہ
تری نگاہ سے رنگینیٔ بیاں لے کر

ادا ہے جو بھی حسینوں کی وہ انوکھی ہے
مزاج پوچھتے ہیں دل میں چٹکیاں لیکر

یہی نہیں کہ ہمیں ہمصفیر بھول گئے
صبا نہ آئی کبھی بوئے گلستاں لے کر

ہزار بار قفس اُس چمن سے بہتر ہے
بہار آئے جہاں تلخیٔ خزاں لے کر

زبانِ حال سے کہتے ہیں یہ شکستہ مزار
زمیں بیٹھ گئی کتنے آسماں لے کر

جب اتنا جذب نہیں سجدہ پاشیاں بیکار
جبیں جھکے تو اُٹھے شانِ آستاں لیکر

فقط وہی نہیں بدلے زبان بھی بدلی
یہ سوچتا ہوں کہ اب جاؤں ترے جہاں لیکر

اب اس کے بعد اثر کیا نباہ کی صورت
وہ سرگراں ہیں محبت کا امتحاں لیکر

علامہ بدر جلالی

ماہِ تمام

نہ جاں سُپاری کے حوصلے ہیں نہ ہمّت پرفشاں قفس میں
نہ موت ہی پر ہمارا قابو نہ زندگی ہے ہمارے بس میں

رہے نہ اگلے رفیق باقی نہ منزلیں ہیں نہ کارواں ہے
مگر ہے باقی وہی پُرانی اَدا جرس میں صدا جرس میں

کبھی مگس تونے یہ بھی سوچا کہ شہد کیا چیز بن گئی ہے
حلاوت روحِ نو بہاراں سمٹ کے آئی گلوں کے رس میں

وہ اسکی ہستی ہلاکِ مستی وہ اسکی نظریں خرابِ بادہ
تمہاری بزمِ طرب کے قابل ادب نہیں بدرِ بوالہوس میں

مدِ نظر سکون ہو جس سے جنونِ دید میں
ایسی نگاہ جرم ہے ایسی نظر حرام ہے

عالمِ ہجر و وصل کے ملتے ہیں دونوں وقت جب
مرحلۂ حیات کا وہ بھی عجب مقام ہے

اسکی نظر سے دیکھئے پستیٔ رہگذر کی قدر
جسکا مدارِ زندگی جلوۂ طرفِ بام ہے

بدر حواس باختہ، ہوش میں شاید آگیا
دار و رسن کا کس لئے آج یہ اہتمام ہے

سلام مچھلی شہری

سکوتِ رقص

زہرۂ محفلِ زندگی ۔ اکیا ہوا،
پائے نازک میں پھر موچ کیوں آگئی؟

آج تو ساز و نغمہ ھم آہنگ تھے
آج شمعیں تبسم بہ مژگاں بھی تھیں
آج اپنے اشارے پہ تھا میکدہ
آج نظریں گلستاں بہ داماں بھی تھیں
ہم تو بھولے ہوئے تھے ترے رقص پر
کیوں ہماری اُمیدوں سے ٹکرا گئی؟

اس سے پہلے تو یہ سوچ لیتے تھے ھم
ساری محفل ہی اک غم کی تصویر ہے
اپنی رقّاصۂ زندگی کیا کرے
اس کے نازک سے پاؤں میں زنجیر ہے
اب تو پت جھڑ کے منحوس دن بھی نہیں
اب تو اپنے چمن میں بہار آگئی؟
آج تو پائے سیمیں میں چھاگل بھی ہے

آج ہاتھوں میں پھولوں کی کنگن[1] بھی ہے
آج تو میکدے پر جوانی بھی ہے
جام و مینا بھی، نغمہ بھی، ساون بھی ہے
صرف اِک رقصِ مخمور کی تھی کمی
اور تُو جوشِ محفل سے گھبرا گئی!

میری رقّاصۂ زندگی! ٹھہر تو
تیری آزردگی کا سبب ڈھونڈھ لُوں
روئے نرگس سے شبنم ہٹا لُوں ذرا
باعثِ مرگِ بزمِ طرب ڈھونڈھ لُوں
کوئی ناگن پسِ شمع پوشیدہ ہے
پنکھڑی تیرے ہونٹوں کی مُرجھا گئی!

دامِ صیّاد کو نذرِ آتش کیا
باغباں کی نگاہوں سے غافل رہے
یونہی دیوار و دَر کو سجایا کئے
رنگِ اربابِ محفل سے غافل رہے
رُوحِ لالہ کہ پامال ہے آج تک
نعشِ فصلِ خزاں پر بھی تھرّا گئی!!

[1] ہندی میں "کنگن" کو مؤنث لکھتے ہیں اور یہ مجھے زیادہ حسین معلوم ہوتا ہے — سلام

افسر سیمابی احمد نگری

جرأتِ گفتار

کس قدر گلستاں ہیں رنگ و نور کے مدفن — میر کارواں کتنے بن گئے ہیں خود رہزن

کھا لیا اندھیرے نے کتنے برق پاروں کو — ٹوٹنا پڑا آخر بربطوں کے تاروں کو

سَم فشاں حوادث کے کتنے قافلے آئے — کتنی کشتیاں ڈوبیں، کتنے چاند گہنائے

بارہا گلابوں کی جان لی ببولوں نے — آدمی کو بہکایا کس قدر رسولوں نے

محوِ خواب ہیں طوفاں آج بھی سفینوں میں — داغ ہیں جبینوں پر، بُت ہیں آستینوں میں

گو کہ فیضِ موسم سے ہر روش مہکتی ہے — آج بھی شگوفوں میں آگ سی دہکتی ہے

یہ بجھی بجھی شمعیں، یہ اُداس ویرانے — ہو گئے تہی آخر زندگی کے پیمانے

زنگِ یاس و محکومی کھا گیا دماغوں کو — پوجتے رہے لالے اپنے دل کے داغوں کو

ہر نفس میں چنگاری، ہر نظر میں ویرانی — اِک سرابِ رنگیں ہے یہ عروجِ انسانی

ہو گئی ہیں چہروں پر نقش حسرتیں کیا کیا — ایک ایک ذرّے میں ہیں قیامتیں کیا کیا

پھر نشاط گاہوں پر مسکرائے غم خانے — مسجدیں شرار آگیں، شعلہ گوں صنم خانے

دہر پر تسلّط ہے اِک مہیب ظلمت کا — عکس بھی نہیں باقی جلوۂ حقیقت کا

یہ فنا زدہ دُنیا قبر ہے محبّت کی — ہر قدم پہ ملتی ہے لاش آدمیّت کی

موت آ کے چھا جائے نو شگفتہ پھولوں پر — حیف ہے مشیّت کے روح سوز اصولوں پر

آس کے کھلونوں سے تو نے مجھ کو بہلایا — گاہ آگ برسائی گاہ خون برسایا

میرے آشیانے پر بجلیوں کی بارش کی — ہاں! مجھے مٹانے کو زلزلوں سے سازش کی

کھُل گیا زمانے پر سحرِ جاوداں تیرا

اب زمین تیری ہے اور نہ آسمان تیرا

حامد اللہ افسر میرٹھی

پیغام و رومان

ہے صبح، اُٹھو خواب سے دُنیا کو جگا دو
امنیتِ جاوید کا پیغام سُنا دو

ماضی کے سوا یاد کوئی چیز نہیں ہے
یہ حال تمہارا ہے تو ماضی کو بھلا دو

تنہا ابدی زیست بھی اک بارِ گراں ہے
گمراہ خضر ہیں انھیں منزل کا پتا دو

مفقود ہوئے جاتے ہیں آزادی کے جلوے
دُنیا سے غلامی کی ضلالت کو مٹا دو

ہے رات قدامت کی نئی صبح پہ چھائی
للّٰہ تم اس رات کے پردے کو ہٹا دو

ہے امن کی خواہش اگر اس دارِ کہن میں
انسان اور انسان کی تفریق مٹا دو

پرواز کو اِک اَور فضا ہو گی میسّر
اِس چرخِ کہن سال کی بنیاد ہلا دو

"اُٹھو کہ غریبی نہیں تقدیرِ الٰہی"
اِس نعرے سے دُنیا کے غریبوں کو جگا دو

سرکش ہو اگر مادرِ گیتی سے فلک بھی
قدموں پہ اُسے مادرِ گیتی کے جھکا دو

افسر یہ کدھر راہ نمائی کو چلے تھے
گم ہو گئے خود تم ہی کچھ اپنا تو پتا دو

غزل

منزل سے بھٹکی ہوئی راہیں
پردیسی کے لب پر آہیں

ایک کے بس کی بات نہیں ہے
تم بھی نباہو، ہم بھی نباہیں

کچھ تو اس سے جی ہلکا ہو
تنہا ہوں تو خوب کراہیں

یہ تم اپنے دل سے پوچھو
ڈھونڈ رہی ہیں کس کو نگاہیں

دُنیا کی ہر چیز ہے بے بس
ہوتا ہے جو کچھ وہ چاہیں

دیکھ کے کیا آئے ہو افسر
کچھ گھبرائی سی ہیں نگاہیں

نجم آفندی

منزل کتنی دور

منزل کتنی دور مُسافر منزل کتنی دور .....

آتے جاتے گلے ملیں گے۔ اپنا اپنا بھید کہیں گے۔ اپنا اپنا رستہ لیں گے

تاریکی اور نور مسافر منزل کتنی دور ....

کب تک گِن گِن قدم اُٹھائیں۔ کب تک تیری شان بڑھائیں۔ تجھ سے شاید آگے جائیں

دولت اور غرور مُسافر منزل کتنی دور.....

دُکھ کی دُھوپ اور سُکھ کا سایا۔ اِن سے کوئی نہ بچنے پایا۔ قدرت نے ہے یہی بنایا

رستے کا دستور مُسافر منزل کتنی دور .....

اب تک لاکھوں ظلم سہے ہیں۔ اب تک ندیوں اشک بہے ہیں۔ رفتہ رفتہ چونک رہے ہیں

محنت اور مزدور مُسافر منزل کتنی دور .....

ادیب مالیگانوی

غزل

جلوے آنکھوں سے گریزاں نہیں ہونے پاتے
وہ جو چاہیں بھی تو پنہاں نہیں ہونے پاتے

آئینہ بھی مہ و انجم کو دکھا سکتے ہیں
یہی ذرّے جو درخشاں نہیں ہونے پاتے

شور تو یہ ہے کہ تقدیرِ چمن جاگ اُٹھی
پھول کیوں شاخ پہ خنداں نہیں ہونے پاتے

انجمن اپنی ہے، ساز اپنا ہے، ہاتھ اپنے ہیں
پھر بھی ہم کُھل کے غزلخواں نہیں ہونے پاتے

یہ ستم کس سے سہا جائیگا اے چشمِ کرم!
داغ سینے کے فروزاں نہیں ہونے پاتے

زلفِ ہستی میں وہ حلقے ہیں ابھی تک باقی
اپنی قسمت سے جو آساں نہیں ہونے پاتے

بزمِ ساحل کو سنورنا ہے اُنھیں کے ہاتھوں
آج جو روکشِ طوفاں نہیں ہونے پاتے

نقص یہ اپنے جنوں کا نہ سمجھنا اے دوست
چاک اگر اپنے گریباں نہیں ہونے پاتے

جلوۂ طور ہوا، چہرۂ گیتی، جن سے
روشن ان کے ہی شبستاں نہیں ہونے پاتے

خاک ہے قابلِ سجدہ انھیں پروانوں کی
جو کسی شمع پہ قرباں نہیں ہونے پاتے

غم سے خوش ہو تو بدل جاتی ہی غم کی صورت
مطمئن ہم، کسی عنواں نہیں ہونے پاتے

کتنے انسان ہوئے شاعرِ کامل بھی ادیب
کتنے شاعر ہیں "جو انسان" نہیں ہونے پاتے

تیغ الہ آبادی

یاد

رات اوڑھے ہوئے آتی ہے فقیروں کا لباس — چاند کشکولِ گدائی کی طرح نادم ہے
لڑکھڑاتے ہوئے تاروں سے گلہ کرتا ہے — یہی معصوم تصوّر کہ ترا محرم ہے

یہی معصوم تصوّر کہ شبستاں بکنار — دل میں دہکے ہوئے ناسور لئے بیٹھا ہے
عیدِ میلاد پہ ہے بوئے گلستاں بردوش — قبر پر عنبر و کافور لئے بیٹھا ہے

کون یہ وقت کے گھونگھٹ سے بلاتا ہے مجھے؟ — کس کے مخمور اشارے ہیں گھٹاؤں کے قریب؟
کون آیا ہے چڑھانے کو تمنّاؤں کے پھول — اِن سلگتے ہوئے لمحوں کی چتاؤں کے قریب؟

وہ تو گم ہو بھی گئی موت کی وادی میں مگر — یاد رقصندہ و رخشندہ و تابندہ ہے
چھپ گیا اپنے نہاں خانے میں سورج لیکن — ابھی سورج کی اک آوارہ کرن زندہ ہے

کون جانے کہ یہ آوارہ کرن بھی چھپ جائے — کس کو معلوم کہ یہ رات بھی کاٹے نہ کٹے
رقص کرتے ہوئے شعلوں کے جنوں کے باوصف — افقِ قلب سے ظلمات کا بادل نہ چھٹے

زندگی نیند میں ڈوبے ہوئے مندر کی طرح — عہدِ ماضی کے ہر اک بت کو لئے سوتی ہے
گھنٹیاں اب بھی مگر بجتی ہیں سینے کے قریب — اب بھی پچھلے کو کوئی بار سحر

سروش عسکری طباطبائی

اعتراف

سانچے میں ظلم و جہل کے ڈھالے ہوئے ہیں ہم
مہمل تصوّرات کے پالے ہوئے ہیں ہم

مطلق لہو میں گرمیٔ ذوقِ عمل نہیں
یوں بے حسی کی برف میں جھالے ہوئے ہیں ہم

روحِ شگفتہ و دلِ بیدار کے بجائے
سینے میں ایک روگ کو پالے ہوئے ہیں ہم

مابینِ کائنات کفِ بحر کی طرح
ساحل پہ زندگی کے اُچھالے ہوئے ہیں ہم

ملفوف اپنی روح کی عریانیوں میں ہیں
پردہ حیا کے چہرے پہ ڈالے ہوئے ہیں ہم

خونخوار ولولوں کو چھپائے ہیں زیرِ پوست
سانپوں کو آستینوں میں پالے ہوئے ہیں ہم

اپنوں کو بھیڑئے بھی نہیں پھاڑتے مگر
اِک دوسرے پہ دانت نکالے ہوئے ہیں ہم

ہر جوہرِ حیات پہ ڈالے ہوئے ہیں خاک
ہر داغِ زندگی کو اُجالے ہوئے ہیں ہم

عفریت ہوں، درندے ہوں، انسان تو نہیں
اِس دائرے سے کب کے نکالے ہوئے ہیں ہم

اِک تار ہے جو ہم کو سنبھالے ہوئے ہے آج
اِک بار ہے کہ جسکو سنبھالے ہوئے ہیں ہم

ہیں بے دیار، گو دلِ یزداں کی تھے خلش
ارمانِ خُلد تھے، پہ نکالے ہوئے ہیں ہم

مکروہ و مسخ چہروں پہ اپنے بہ احتیاط
رنگین نقاب مکر کی ڈالے ہوئے ہیں ہم

تہذیب ایک کھوکھلی دیوار ہے جسے
کمزور بازوؤں پہ سنبھالے ہوئے ہیں ہم

عمراؔن انصاری

بنتِ آدم

کتنی پُرکار و طرب ناک ادائیں لے کر
خطِ رُخسار پہ حوروں کی حیائیں لیکر
اپنے شانوں پہ فرشتوں کی ردائیں لے کر
گوشۂ دل میں جواں سال خطائیں لیکر

بزمِ ہستی میں یہ بے خوف چلی آئی ہے
باغِ رضواں کی فضاؤں میں ڈھلی آئی ہے

ذرّہ ذرّہ کو یہ، وہ جذب و اثر دیتی ہے
سنگ کے دل کو بھی احساس سے بھر دیتی ہے
نغمہ و شعر کو انجم کی نظر دیتی ہے
روحِ کونین کو یہ روحِ دِگر دیتی ہے

رُخِ روشن کے مہ و مہر ترانے گائیں
زُلف و کاکل سے گھٹاؤں کو پسینے آئیں

ڈھل کے فردوس سے شیشہ میں اُتر آئی ہے
پہلوئے یار میں بجتی ہوئی شہنائی ہے
اُڑتے آنچل کی طرح نیندوں میں لہرائی ہو
ملکۂ خواب ہے، سپنوں کی توانائی ہے

شعلہ شبنم سے، شراروں سے شرابیں کھینچے
بھیگی پلکوں سے اُجالوں کی طنابیں کھینچے

اپنے دامن کو نچوڑا تو بنا مے خانہ
شوخ نظروں کو اُٹھایا تو ڈھلا پیمانہ
زُلف چہرے سے ہٹالی تو گرا پروانہ
ثبت کی مہر لبوں پر تو ہوا افسانہ

قدِ بالا تو قیامت کا نمونہ ٹھہرا
دلِ دیوانہ مبارک ہو ترے سر سہرا

اسکی رگ رگ سے محبت کی صدا آتی ہے
کھول دے بال تو جنت کی ہوا آتی ہے
ہاتھ لہرائے تو بے موت قضا آتی ہے
مُسکرا دے تو فرشتوں کی دعا آتی ہے

یہ جو اُٹھ جائے تو رعنائی فطرت نہ رہے
چاند ہو ماند، ستاروں کی ضرورت نہ رہے

اظہر سعید اظہر

نئی اُمنگ

مرے جنوں کی دسترس سے کون دُور رہی بھلا
ہزار بار میں نے بڑھ کے آسماں کو چھو لیا

کچھ اس طرح سے میں نے لغزشوں کا آسرا لیا
کہ سخت راہ کی صعوبتوں کا منہ اُتر گیا

مری ہی کاوشوں کا گرم خوُن تھا جو بارہا
رگِ خزاں میں نوبہار بن کے دَوڑنے لگا

غرورِ شہریار، و نازِ حسن جانے کتنی بار
مرے وقارِ سرکشی کی آنچ سے پگھل گیا

بٹھا کے نیچ وادیوں کو چوٹیوں کے دوش پر
جبینِ آسماں کو میں نے خاک پر جھکا دیا

مری گرج نے بادلوں کے دل میں آگ پھونک دی
مری کڑک نے بجلیوں کا زہرہ آب کر دیا

مری نظر کی برہمی سے قصر و بام ہِل گئے
مری جبین کی خودسری سے آستاں لرز اُٹھا

مرے جوان خوُن نے مرے سجل شباب نے
فروغِ مہر و ماہ کو بھی آئینہ دکھا دیا

پھر آج اک نئی اُمنگ لیکے بڑھ رہا ہوں میں
پھر آج میری گونج سے ہے بستیوں میں غلغلا

پھر آج میرے ہاتھ میں نشانِ سُرخ دیکھ کر
گلوں کا منہ اُتر گیا شفق کا رنگ اُڑ گیا

خلیل الرحمٰن اعظمی

بادِ سموم

یہ فضائے نور اور جشنِ مسرت کی یہ دھوم
ہیں مگر جاری ابھی تک عہدِ ظلمت کے رسوم
فصلِ گل اور اب بھی چلتی ہے وہی بادِ سموم
یہ بہار اور اب بھی غنچے مسکرا سکتے نہیں

ساحرِ افرنگ کا پہلا اثر ٹوٹا تو کیا
اب بھی رہزن ہیں طلسمِ راہبر ٹوٹا تو کیا
اِک نیا زنداں ملا، زنداں کا در ٹوٹا تو کیا
اب بھی یہ مجبور قیدی سر اُٹھا سکتے نہیں

ہے وہی نفرت، وہی ہنگامۂ دیر و حرم
ہے وہی زخمِ جگر ابتک وہی ہے چشم نم
تیز ہوتا جا رہا ہے اور بھی طوفانِ غم
اب لہو سے بھی چراغ اپنا جلا سکتے نہیں

بڑھ رہا ہے آج احساسِ جفائے باغباں
گھات میں رہتی ہیں لیکن اب بھی پیہم بجلیاں
روز رہتا ہے نئی زد پر ہمارا آشیاں
آگ لگتی ہے چمن میں چہچہا سکتے نہیں

اب نئے آئین ہیں اور ان کی تفسیریں نئی
اب نئے ہیں جرم اور ان کی ہیں تعزیریں نئی
باغیوں کے واسطے لاتے ہیں زنجیریں نئی
جال ہیں اتنے کہ وحشی بچ کے جا سکتے نہیں

جاگ اُٹھا ہے مگر اب بیکسوں کا یہ جہاں
گرم خوں ہے آج دہقانوں کی رگ رگ میں رواں
یہ اگر چاہیں اُلٹ دیں گے زمین و آسماں
اب غلاموں کی اُمنگوں کو دبا سکتے نہیں

SHANTA INDRA

REHANA IN "SURAJ MUKHEE"

ادارہ

اُردو کے نئے رسالے

ماہنامۂ "انتخاب" الہ آباد

انتخاب کہنے کو تو ایک فلمی ماہنامہ ہے لیکن اس میں ادب کا حصّہ بھی کم نہیں۔ جون ۴۹ء نمبر میں ۵۲ صفحات میں سے ۳۰ صفحات پر افسانے ہیں۔ اور چار صفحات پر اچھی نظمیں نفسیاتی طور پر ناہید کا افسانہ "دھچکا" کافی کامیاب ہے اس میں درمیانی طبقے کے ہندوستانی گھرانوں کی لڑکیوں کی جنسی الجھنوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ درمیانی طبقہ کی سہمی ہوئی روح کو پُرانے نظام کی بے بضاعتی کا احساس ہے اور وہ بغاوت کے لئے سازش کر رہی ہے۔

انتخاب نے ادب و فلم میں توازن قائم کرنے کی کوشش تو کی ہے لیکن اصل میں اس کوشش میں نہ ادب کا بھلا ہے نہ فلم کا کیونکہ اگر محض "فلم" ہی کو موضوع بنایا جائے تو آج بھی یہ ضرورت بحالہ باقی ہے اور ملک سے کوئی رسالہ فلم کی تمام تر ضرورتوں پر حاوی شائع نہیں ہوتا۔

ان ضرورتوں میں، سچّی تنقید بے لاگ تبصرہ، ٹیکنیکل امور فوٹوگرافی، سنیوریو، اداکاری، میک اپ کا فن، سیٹنگ، ہدایت کاری، ہدایت کار کے فرائض، فلمی افسانہ لکھنے کا فن، فلمی کہانی کی خصوصیات، یہ اور ایسے ہی دسیوں موضوع ہیں جن پر بحث کرنے اور معلومات پیش کرنے کی ضرورت ہے، لیکن یہ ضرورت کسی طرف سے پوری نہیں ہو رہی ہے۔ اگر "انتخاب" ہی ان ضرورتوں کو پورا کرے تو بہت جلد فلمی دنیا میں خصوصیت حاصل کر سکتا ہے۔

قطع نظر اس معیار کے فلمی دنیا کے تمام اداروں اور ان اداروں کے ذمہ دار فنکاروں سے انتخاب کا مستقل اور مسلسل ربط ہونا لازمی ہے۔ آرٹ کے متعلق ان کی رائیں اور انکا زاویۂ نگاہ عوام تک اور عوام کے مطالبے ان تک پہونچانا ضروری ہے فلم آرٹ کی دنیا کافی رنگین ہے۔ اس دنیا میں اتنے پھول، اتنے ستارے اور اس قدر نت نئے ساز و سامان ہیں جن سے دلکشی کا ایک جہان سجایا جا سکتا ہے۔ اس طرح ایک ادارہ ملک کو بہت کچھ فائدہ پہونچا سکتا ہے اور عوام کی دلچسپیوں اور فائدہ مندیوں کا سبب بھی بن سکتا ہے۔

جہاں تک کسی ادبی رسالہ کا تعلق ہے اس کا مقصود ٹھوس اور افادی مواد ہوتا ہے۔ اگر کسی ایسے ماہنامہ کی جمالی حیثیت کمزور ہے تو کوئی اعتراض کی بات نہیں، لیکن فلمی ماہنامہ، میری رائے میں آرٹ پیپر سے ادھر شائع ہی نہیں ہونا چاہئے۔ اُردو میں کوئی ایسا فلمی ماہنامہ نہیں ہے جو انگریزی کے "فلم انڈیا" کا مثیل قرار دیا جا سکے، لیکن انگریزی میں اس کے مقابلے کے پرچے شائع ہونے لگے ہیں۔ اگر اُردو میں بھی اتنا ہی حسین و بلند معیار ...فلمی ماہنامہ شائع ہو تو اس کی کامیابی میں کوئی شک نہیں۔

اس لحاظ سے انتخاب بہت مایوس کن ہے۔ یہ مایوسی امید سے بدل سکتی ہے اگر ادارہ ان ممکنات پر غور کرے۔ بہر حال موجودہ صورت میں ادب و فلم کا یہ ہلکا پھلکا مجموعہ پڑھنے کے قابل ضرور ہے۔

قیمت فی پرچہ چھ آنے۔

پتہ :- دفتر انتخاب ۱۱۰ سبزی منڈی الہ آباد

"شاہکار" انقلاب نمبر

لاہور

ماہنامۂ "شاہکار" پاکستان کے ماہناموں میں نہایت ممتاز ماہنامہ ہے جو ادب اور زندگی پر عمیق نظر رکھتا ہے۔ اور اُردو ادب کے نئے تعمیری و تخلیقی رجحانات کا نہایت سنجیدہ ترجمان ہے۔ شاہکار نے جنوری ۴۹ء میں "انقلاب نمبر" کے عنوان سے جو نمبر شائع کیا وہ ادب کی تاریخ میں ایک یادگار مجموعہ ہے۔ یہ نمبر گیارہ مضامین پانچ کہانیوں، تیس نظموں اور غزلوں پر مشتمل ہے۔ ہر طرح کے

سوچنے اور مختلف مکاتیبِ خیال سے تعلق رکھنے والے شعراء، ادیبوں اور مفکرین نے اپنے مقالات میں انقلاب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو ادب میں یہ کوشش بڑی تعمیری حیثیت رکھتی ہے، ان مضامین میں غیر جانبدار ہو کر اردو ادب کے نئے تقاضوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ہماری اجتماعی زندگی کے جملہ جدید مسائل، بدلتے ہوئے ماحول، سماج کی تغیّر پذیری، انقلاب پسندی اور ادب کی تخلیقی قوتوں پر نہایت سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔

اداریہ میں محمد آصف، مدیر "شاہکار" تحریر فرماتے ہیں۔

ہماری اجتماعی زندگی ایک انقلابی ماحول میں سے گزرتی ہوئی جدید مسائل کو جنم دے رہی ہے اور ان میں سے مقدم مسئلہ یہ ہے کہ ہر زندہ انسانی معاشرہ تغیّر پذیر اور انقلابی ہے اور ہر زندہ ادب تخلیقی اور متحرّک۔

" تاریخ " زمان و مکان میں انسان کے اجتماعی شعور کی مسلسل حرکت کا نام ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل اس مسلسل تغیّر کے سنگِ میل ہیں، اگر ہمیں اپنی اجتماعی خودی کا اظہار منظور ہے اور ہم آزاد، متمدّن اور فعّال اقوام کی صف میں شامل ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں اپنی تاریخ، اور ماحول کا فنی اور علمی مطالعہ کرنا ہوگا، اردو ادب سے جمود، بے حسی اور فرسودہ روایات کو حذف کر کے جدید ماحول سے ایک مطابقت پیدا کرنی ہوگی۔

اس کے بعد محمد آصف صاحب نے نہایت مدلّل انداز میں ترقی پسند ادیبوں سے خطاب کیا ہے۔ اور آخر میں کہا ہے، کہ انھیں اپنی قوم کے تاریخی اور ثقافتی ورثہ کا احساس کم ہے۔

" ہم اپنے ترقی پسند ادیبوں کی خدمت میں مؤدبانہ گزارش کریں گے کہ وہ اپنی قوم کے عمرانی اور ثقافتی مزاج کو سمجھنے کے بعد کچھ لکھیں تاکہ ان کی ترقی پسندی موثر ہو سکے اور ان کا عوام سے صالح رشتہ قائم ہو جائے۔

" جس عمل اور تحریک کو عوام سے ہم آہنگی حاصل نہیں ہوگی وہ کسی بڑی تخلیق و تعمیر کی محرک نہیں ہو سکتی،

پروپیگنڈے کے ذریعے ہر سطحی تحریک کی عظمت کو عارضی طور پر منوایا جا سکتا ہے لیکن یہ پروپیگنڈا نتیجہ خیز نہیں ہوگا۔ طبعی قانون یہی ہے کہ تحریکات اپنی داخلی قوت سے زندہ رہتی ہیں۔"

آخر میں وہ ادیبوں سے اپیل کرتے ہیں، کہ ــــ

" ہماری ترقی پسند تحریک جو ۱۹۳۶ء میں پیدا ہوئی اس میں اور ہمارے سماجی رجحانات میں تضاد ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ ہمارے ادیب اپنے ماحول اور تاریخ سے بہت ہٹ کر سوچتے اور لکھتے ہیں۔ ہمارے اصل مسائل اور ادیبوں کے ذہنی مسائل میں بعد المشرقین ہے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ حقیقت اور رومان کی اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی جائے اس کا ایک ہی ذریعہ ہے کہ ہم نہایت خلوصِ نیّت اور ذمہ داری سے اپنی تاریخ، تمدّن، انسانیت کے جملہ مسائل کا مطالعہ کریں اور اس ترکیبی عمل سے اپنی زبان کے ادب کو فروغ دیں۔"

(شاہکار انقلاب نمبر، جنوری ۴۹ء)

" رومان ـ حقیقت " کی خلیج کے علاوہ اور بھی کئی بنیادی امور ہیں جن کے متعلق ترقی پسند ادب کو اپنا فرض ادا کرنا ہے۔ ماحولی ضرورتوں کے پیشِ نظر سماجی شعور پیدا کرنا اس کا فرض ہے، محمد آصف صاحب نے ترقی پسند ادیبوں کو جو اہم مشورہ دیا ہے وہ ہماری ذمہ داریوں کے متعلق اہم اشارہ ہے اور بے حد بنیادی اور مخلصانہ کوششوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ ترقی پسندی چند افراد کی اجارہ داری بن کر رہ گئی ہے اور انھوں نے ترقی پسندی کے مقاصد کو نہایت سطحی و ہنگامی مقاصد تک محدود کر دیا ہے۔ یہ مقاصد حیاتِ اجتماعی کے تغیّر و ارتقاء میں کم امداد کرتے ہیں اور ادب سے تعلق رکھنے والے مسائل کی تبدیلی و ترقی کا فرض تو ان کے ذریعہ پورا ہوتا ہی نہیں۔

ترقی پسندی کی ساری کوششیں ایک منفی و تخریبی مرکز پر منجمد ہو کر رہ گئی ہیں۔ صحیح سوچنے اور کام کرنے والوں کا پہلا فرض یہ ہے کہ اس مرکز کو پگھلانے کی سعی کریں۔

لیکن دو قوموں کے ثقافتی مزاج سے واقف ہونے کے

متعلق ایک سوال ضرور پیدا ہوتا ہے اگر اس سے مراد مذہبیت ہے تو مذہبی فرقہ واریت نے جو کچھ غضب ڈھایا اسے بیچارے عوام خوب جانتے ہیں اور اگر ان کا مقصد سماجی مسائل سے ہے تو مفلسی جہالت، تہذیبی پست و بلند اور اقتصادی عدم توازن اور بہت سی ناہمواریاں موجودہ نظام کی گنائی جا سکتی ہیں۔

اب رہی کلچر... کی پرانی بحث، سو اگر غور کیا جائے تو ہندوستان چھوٹی چھوٹی تہذیبوں کا ایک.... اجتماع ہے لیکن ان سب کی روح ایک ہے۔ اسی تہذیبی وحدت کی بنیاد پر آزاد ہندوستان کی تشکیل ہونی چاہیے تھی۔ لیکن تمدّن کی بحث نے مذہب کا روپ اختیار کر لیا اور وہ سیاسی نظریہ بن گیا۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے۔ اگر اٹک سے کٹک اور پشاور سے لے کر راس کماری تک کے ادیب سر جوڑ کر بیٹھتے اور برطانوی سامراج اور اس کے سنگدل ایجنٹوں کی چالوں کے خلاف متحد ہوتے تو آج یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا لیکن ترقی پسند ادیبوں کی غلط حکمت عملی اور مجرمانہ خاموشی نے ہماری زندگی کو ذلّت کے غار میں گرنے دیا۔ یہ ایک دل ہلا دینے والا حادثہ ہے، اصل میں لسانی مسئلے کی فرقہ پرستانہ معاملت نے ادیبوں کے ذہنی انتشار میں اضافہ کیا اور صوبہ جاتی احساس کے نذر ہو گئے اپنے اپنے صوبے کے کلچر اور زبان و ادب کے زندہ رکھنے کا خیال ان میں پروان چڑھنے لگا۔ ادھر سیاست نے اسے کل ہند رنگ دے دیا۔ ظاہر ہے مسلمان احیاء کی ان تحریکوں سے سراسیمہ ہو گئے اور انھوں نے جداگانہ تمدّن کی بنیاد پر اپنی سیاسی وحدت کا مطالبہ کیا۔ اگر تمدنی احیاء کی تحریکیں محدود رہتیں تو یہ ہوّا ہرگز کھڑا نہ ہوتا۔ اور لوگ سماجی انصاف ہی کو اپنا مقصود بناتے اور اسی کی بنیاد پر نیا نظام ترتیب دیا جاتا۔ مثلاً ٹیگور اور سرت چندر کے کارناموں اور بنگال کی دوسری تحریکوں کو بنگال ہی کے کلچرل احیاء سے تعبیر کیا جاتا تو بہت بہتر ہوتا۔ اس معاملے میں ترقی پسندوں نے کلچرل وحدتوں کے خلاف قدم نہیں اٹھایا، تمدّنی اختلافات ان کے نزدیک علیحدگی کا باعث نہیں ہے۔ بلکہ وہ ہم آہنگی پیدا کرنے کی طرف پھر اسی طرح بڑھ رہے ہیں، جس طرح چند سال پہلے بڑھے تھے۔

تقسیم سے پہلے ہندوستان کی قومی زبان کے سلسلہ میں وہ "ہندوستانی" زبان کے قائل نہیں تھے۔ رائے پور، سی پی، کی کانفرنس (۱۹۴۳ء) میں جب ایک موقعہ پر خود ہندی والوں نے ترقی پسندوں سے زبان کے متعلق سوال کیا تو انھوں نے کہا "انجمن اس بات کو تسلیم نہیں کرتی کہ "ہندوستانی" کوئی زبان ہے۔ اُردو اور ہندی دو علیحدہ علیحدہ زبانیں ہیں، اور دونوں کا ادب علیحدہ علیحدہ پروان چڑھ رہا ہے اور ہمیں دونوں زبانوں میں اپنے ترقی پسندانہ مقاصد کی ترویج کرنی چاہیئے"

لیکن تقسیم کے بعد زبان کے مسئلہ نے جب دوسرا رخ اختیار کیا اور کئی صوبوں نے ہندی کو دفتری زبان بنا دیا۔ اور اس کا ردّ عمل مسلمانوں پر نئی صورتوں میں ہونے لگا تو وہ "ہندوستانی یا اردو" کے قائل ہو گئے اور اس طرح انھوں نے مسلم عوام کی ہمدردی حاصل کرنے میں کوئی تکلّف نہیں کیا۔

لیکن یہ عمل نہ تو سنجیدہ تھا اور نہ فائدہ مند اس لئے انہیں پھر واپس ہونا پڑا۔ اب ترقی پسندوں کی کانفرنس منعقدہ ۲۶ مئی ۱۹۴۹ء (بھیڑی) میں یہ طے کیا گیا ہے کہ ہندی اور اُردو کے جلسے ملے جلے ہی ہونے چاہئیں، اسطرح وہ پھر "ہندوستانی" کے قائل ہو گئے ہیں۔

اِک نہایت اہم سوال

لیکن حالات نے ہمیں ایسے موڑ پر لا کھڑا کیا ہے کہ آج بھی تمدنی مسائل کے سلسلہ میں کسی ہم آہنگی کی امید نہیں ہے۔ بلکہ دونوں حکومتوں میں جس قسم کے آثار اُبھر رہے ہیں ان سے ہم اسی نتیجے پر پہونچتے ہیں کہ دو حکومتوں کی طرح دو منفرد تمدّن بن جائیں گے۔!؟ اُدھر پاکستانی تمدّن کی بنیاد پر ایک علیحدہ پاکستانی ادب پیدا کیا جائے گا، اِدھر ہندی تمدّن کی بنیاد پر ایک جداگانہ ہندوستانی ادب'!!

لیکن یہ سب کچھ غلط ہو گا۔ ادب کو سیاست کا طفیلی نہیں بننا چاہیئے، اُسے تو زندگی کے اُن مسائل کو سلجھانا چاہیئے جن سے زندگی دونوں ملکوں میں دوچار ہے۔

بہرحال انھیں مسائل کی اجتماعی حیثیت کے پیش نظر ہماری رائے ہے کہ ترقی پسندی اور اس سے متعلق فرائض بچّوں کا کھیل نہیں، ہنگامی سیاسی مسئلوں "پر ہنگامی احتجاجی تجویزیں پاس کر دینے سے ترقی پسند اپنے فرائض سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتے، اور نہ صرف چند طنزیاتی کہانیاں لکھ کر وہ اجتماعی مسئلوں کے حل کی داغ بیل ڈال سکتے ہیں۔ انھیں ان چیزوں سے بہت بلند

ہو کر کام کرنا پڑے گا ورنہ یہ تحریک بالغ ہونے سے پہلے ہی دَم توڑ دے گی۔

اداریہ کے بعد محمد آصف کا مقالہ "انسان اور انقلاب" ایک اہم تاریخی جائزہ ہے جس کی حیثیت جائزہ سے بڑھ کر ایک تبصرہ کی بھی ہے۔ اس جائزہ میں ان کے تنقیدی عناصر کے اندر لہجے کا اتار چڑھاؤ ان کے اپنے روحانی تقاضوں کا چغل خور بن گیا ہے ہندو سماج کی تحلیل و تشریح میں وہ اپنے لاشعور کو نہیں دبا سکے۔ اسلام کا ذکر کرتے ہوئے وہ خود کو نہیں چھپا سکے اور کمیونزم کے ذکر میں لہجے کی بے کیفی آشکار ہو ہی گئی ہے لیکن اس سے یہ مراد نہیں ہے کہ انھوں نے جائزہ اور تبصرہ میں انصاف سے کام نہیں لیا ہے۔ یہ مقالہ اپنی جگہ بے حد اہمیت رکھتا ہے۔

اسی طرح محمد حسن عسکری کا مقالہ "ادب اور انقلاب" نہایت گہری چیز ہے۔ جس میں انقلاب کے معنی و مفہوم پر مفکرانہ انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ حسن عسکری خون ریزی کے ذریعہ انقلاب کو ذی ثبات نہیں سمجھتا۔ وہ ادب کے ذریعے نفسیاتی اور اخلاقی انقلاب کا قائل ہے۔

مقالہ نہایت آزاد خیالی سے لکھا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں بعض مسائل میں عسکری کی رائے سے اختلاف ہو۔ لیکن جہاں تک اس مقالہ کی علمی حیثیت کا تعلق ہے وہ اختلاف و اتفاق سے بلند ہے۔ مرزا محمد حسین کا مضمون "اشتمالیت اور اسلام" ایک خاص طبقہ کے زاویہ نگاہ کی نمائندگی کرتا ہے جو اسلام کے معاشی نظام کو اشتمالی نظام معاشی کا توڑ سمجھتا ہے۔ لوئی فشر کے ایک مضمون کا ترجمہ "بالشویکی انقلاب کدھر" معلومات میں اچھا خاصا اضافہ کرتا ہے۔ مراکش کی فاطمی سلطنت" اور لیبیا" پر مولانا اظہر امرتسری کا تاریخی مضمون بھی معلومات سے پُر ہے۔ م۔م۔ جوہر میرٹھی کا مضمون مارکس کا نظریہ "تاریخ کی مادی تعبیر" اپنی خاص اہمیت اور افادیت رکھتا ہے۔ اسی طرح محمد صدیق کلیم کا مضمون "انقلاب اور تعلیم" ایک بر وقت مطالبہ ہے جسے حکومت پاکستان کو پورا کرنا چاہیے۔

اس کے علاوہ "ادب کی بدلتی ہوئی قدریں" "ٹالسٹائی کی فنکارانہ عظمت" "ایٹم اور انقلاب" تمام کے تمام معیاری مضامین ہیں، جن سے ایک پارٹی کے محدود مقاصد کی بو نہیں آتی اور جو اپنے محدود نتائج نہیں رکھتے۔ یہ تمام مقالے ناظرین کو آزاد ذہن و فکر کے ساتھ مطالعہ کی دعوت دیتے ہیں۔

مقالوں کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے اکثر بزرگ و نوجوان شعراء کی نظمیں اور غزلیں ہیں جن میں فراق گورکھپوری، رعنا اکبر آبادی، اختر ہوشیارپوری، اشعر ملیح آبادی، عبادت بریلوی، عدم، مقبول حسین احمد پوری وغیرہ آپ کے محبوب شاعر بھی ہیں۔ اور ایک لحاظ سے ان کی نظمیں اور غزلیں خوب ہیں۔ لیکن نظم کا حصہ، نثری حصہ سے توازن پیدا نہیں کرتا۔ اپنے نام کے لحاظ سے تمام نظمیں انقلاب کے متعلق ہونی ضروری تھیں جن سے ہمارے زمانے کے شاعروں کا انقلابی زاویۂ نگاہ ظاہر ہوتا، اور جن سے یہ اندازہ ہو سکتا کہ کون انقلاب کو کتنا سمجھتا ہے۔؟

نظموں کے بعد پانچ افسانے ہیں جن میں عبدالرحمن چغتائی کا افسانہ "انصار" بھی ہے اور خوب ہے۔

بہرحال شاہکار کا یہ نمبر اردو ادب کی ایک بہت بڑی خدمت ہے۔ ناظرین کو اسے ضرور پڑھنا چاہیے۔

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنہ (عہ/)

ملنے کا پتہ

ادارۂ ادبیات جدید۔ مسلم اسٹریٹ۔ سرکلر روڈ۔ لاہور

ماہنامہ جاوید

گہوارۂ ادب لاہور

عمل، امید اور روشنی کا پیامبر "جاوید" اپنی کاوشوں کے اعتبار سے روشنی کی ایک کرن ہے جسے دیکھ کر پاکستان کے برسر اقتدار طبقہ کی آنکھیں چندھیا گئی تھیں۔ جاوید نے عالمگیر اور زندۂ جاوید انسانیت کی راہ اختیار کی ہے۔ اس کا مقصد ننھی سی کرن کو شعلہ میں تبدیل کر کے زندگی کے بجھے ہوئے چراغوں کو جگمگانا ہے۔ جس طرح ہندوستان میں بورڈ آف سینسر فحاشی کی آڑ لے کر بعض فلموں پر قینچی چلاتا ہے۔ اسی طرح پاکستان کے ارباب حکومت نے بھی بعض عوامی رسائل کے متعلق کم و بیش یہی رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ لیکن اس کا کیا علاج کہ اب عوام کی محرومی کا خارا شگاف تیشہ جوئے خون لانے کے بجائے جوئے شیر لانے میں مصروف ہے اور اُسے یہ انداز پیچ استحصال اور جبر و تشدد کے تازیانوں نے سکھلائے ہیں ----

جاوید کے شمارہ نمبر ۶ میں وحید قریشی کا مقالہ "اردو کے جدید تر شعراء"

عارف متین، مجید امجد، عارف جمیل، منیب الرحمٰن اور عزیز حامد مدنی کی شاعری پر مختصر تجزیاتی تبصرہ ہے۔ دوسرا مقالہ سہیل عظیم آبادی کا ہے جس میں اس نے تقسیم پنجاب کی خونچکاں داستان پر ٹیگور کے انداز میں آنسو بہائے ہیں۔ فکر تونسوی کی ڈائری "چھٹا دریا" پر مقالہ لکھنے کے لئے سہیل سے زیادہ موزوں اور کوئی شخص نہیں ہو سکتا تھا اس لئے کہ سہیل بھی اس بہار کے رہنے والے ہیں جہاں کی زمین ایک مرتبہ کانپی تھی۔ پھر ایک جنوں خیز طوفان آیا جس میں انسان نماگولوں نے چمن کی رونق کو اُجاڑ دیا تھا۔ سہیل نے بڑی گرمجوشی سے فکر تونسوی کو خراج تحسین ادا کیا ہے۔

فکر کے سلمان دوست عارف، قتیل، ممتاز اور ساحر کی انسان دوستی بھی قابلِ ستائش ہے۔ اگر اس ذیلی برِ اعظم میں اس قسم کی فضا تیار ہو جائے تو یہ بڑی مبارک چیز ہوگی۔ "چھٹا دریا" بقول سہیل برطانوی سیاست کا آخری نشتر تھا جس نے پانچ دریا والے پنجاب کی چھاتی کو چیر دیا۔ اس نئے دریا میں پانی کی بجائے خون بہا اور اس خون میں سامراج کے ایجنٹوں اور فرقہ پرستوں کا زہر گھلا ہوا تھا۔

اس کے بعد "امریکی کوڑھ" امریکی سائنسدانی پر ایک برمحل طنز ہے۔ مضمون سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ امریکہ کے ماہرین سائنس و نفسیات انسانی ذہن کو کسی دوسرے ڈھرّے پر چلانے کی کوشش میں ہیں۔ مرض کو خواہ جسمانی ہو یا اقتصادی دماغی وہم بتایا جا رہا ہے چنانچہ مضمون نگار نے مضمون کے آخر میں بڑے مزے کا ایک جملہ لکھا ہے۔

"کہ اگر انسانی کھوپڑی سے دماغ نکال کر اس میں بھوسہ بھر دیا جائے تو کیسا رہے"؟ ایک اور جملہ ملاحظہ فرمائیے "ایک روز امریکی ماہر نفسیات اس بات کا پتہ بھی چلائیں گے کہ انسان جنون کے سوا اور کچھ نہیں اور یہ آٹیم بم کے بعد دوسری دریافت ہو گی۔ جس سے امریکی طرزِ معاشرت کی جڑیں مضبوط ہوں گی"!

ابو سعید قریشی نے اپنے مضمون میں اُن سکّوں کو گنایا ہے جو نا اہل، خود غرض خوشامد پسند اور ناعاقبت اندیش حاکموں کے یہاں رائج ہیں۔ اور خوشامدی، بے غیرت قسم کے اہلکاروں کی نا اہلی کو کارگزاری میں تبدیل کرنے کی سیڑھیاں بن سکتے ہیں۔ اُن کے نام یہ ہیں۔ مدح وثنا، دین و ایمان، کنبہ پروری، اور دوست نوازی، دستِ غیب (رشوت) اور کاروبار سلطنت' اس قسم کی فضا اب تک حیدرآباد دکن میں رہی'، حیدرآباد کا جو حشر ہوا وہی انجام ہر اُس ملک کا ہو سکتا ہے جہاں یہ سکّے رائج ہوں۔

نظم کے حصّے میں ناصر کاظمی کی غزل نما نظم بہت خوب ہے جس میں فسادات سے متعلق جذبات نگاری کی گئی ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی، بلراج کومل اور شاہد نصیر کی غزلوں میں جذبات کی شدّت ہے اور غزلوں کا موضوع فرسودہ روایتوں سے پاک ہے منیب الرحمن کی نظم "بہار کی ایک رات" میں سادگی اور پُرکاری کی . . خوبیاں موجود ہیں۔

خاطر غزنوی نے پشتو ادب کے سترھویں صدی کے وطن پرست شاعر خوش حال خاں خٹک کی ایک نظم کا بہت کامیاب ترجمہ کیا ہے۔ کرتار سنگھ دگل کا افسانہ "گور کی نگری میں" صحت مند نقطۂ نظر پیش کرتا ہے۔ عزیز اثری نے اپنا مضمون "ہماری سرگرمیاں" بڑی کاوش سے لکھا ہے۔

جاوید کا سرورق خاصہ دلکش ہے۔ کتابت طباعت اچھی ہے لیکن سائز یہ نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ اگر جاوید میں تاریخ، اقتصادیات اور سیاسیات سے متعلق ٹھوس مضامین شائع ہوں تو پڑھنے والوں کو بہت فائدہ پہونچ سکتا ہے۔

دفتر ماہنامۂ جاوید
گہوارۂ ادب لاہور

ماہنامۂ ایوان

حیدرآباد دکن

ایوان حقیقت میں حیات آشنا ادب کا ایوان ہے جس کی بنیادیں ادب کی توانا قدروں پر قائم کی گئی ہیں۔ اس کی تعمیر میں سراپا توانائی نہیں بلکہ آرٹ کی دوسری خوبیاں بھی شامل ہیں یہ دکن کی پامال انسانیت کے لئے حیات افزا پیغام ہے اور سرزمین حیدرآباد سے اس کا ظہور فال نیک ہے۔ زیر تبصرہ افسانہ نمبر میں جن فنکاروں کی اعانت حاصل کی گئی ہے وہ زندگی کے صحیح نباض ہیں۔ ابراہیم جلیس کا افسانہ "پرمٹ" حیدرآباد کے متوسط طبقہ کے مسلمانوں کی پُر آشوب زندگی کا آئینہ دار ہے۔ سراسیمگی کے عالم میں ترکِ وطن کرتے وقت وہ جن مصائب سے دوچار ہوتے ہیں اور پاکستان پہونچ کر انھیں جس بے التفاتی اور کس مپرسی

کا شکار رہنا پڑتا ہے۔ اس کی صحیح تصویر افسانہ میں پیش کی گئی ہے۔ خواجہ احمد عباس کا افسانہ "جاگتے رہو" میں ہندوستان کی سرمایہ داری کو اس منزل میں دکھایا گیا ہے کہ وہ اپنے لئے خود عذاب جان بن گئی ہے۔ سرمایہ دار کا محتاط رہنا اپنی دولت کی حفاظت کے نئے نئے طریقے سوچنا پھانک کر اپنی کوٹھی کے چوکیدار سے بدگمان ہونا بہت ہی مضحکہ خیز چیز ہے۔ کنہیا لال کپور کا افسانہ "شن شن شان" پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا ملک اسی دور سے گزر رہا ہے۔ حکومت وقت کہتی ہے اگر عوام کو کھانا نہیں ملتا ہے۔ تو انہیں غم غلت کھانا چاہئے کیونکہ اس کے پاس کوئی الہ دین کا چراغ تو ہے نہیں کہ ملک کی کایا پلٹ ہو جائے۔ کپور نے ارزاں قسم کی نااہل لیڈر شپ پر اچھی خاصی چوٹ کی ہے۔

ادارہ کی طرف سے اُردو کے مستقبل پر نہایت معقول اور حوصلہ افزا خیالات کا اظہار کیا گیا ہے اس میں کہیں شکست خوردگی کی جھلک نہیں پائی جاتی۔ حیدر آباد کی دو سالہ تاریخ میں موجودہ دور اُردو کے لئے واقعی بڑا نازک اور ابتلا کا دور ہے۔ ایسی فضا میں ہوش و حواس قائم رکھنا بڑی بات ہے۔

ایوان کا نظمی حصہ بھی بے کار نہیں ہے۔ لیکن اس میں اضافہ اور ترقی کی کافی گنجائش ہے۔ کتابت طباعت بہتر...... معلوم ہوتی ہے۔

قیمت فی پرچہ آٹھ آنے

پتہ :- ماہنامہ "ایوان" معظم جاہی مارکیٹ۔ حیدر آباد دکن۔

ماہنامہ "شعلہ" کانپور

شعلہ واضح طور پر ترقی پسند ادب اور ترقی پسند تحریک کا ترجمان ہے۔ رحمت شمیم اور صابرہ سلطانہ اسے ترتیب دیتے ہیں۔ اداریہ میں "ادیب امن عالم کی حفاظت کریں" کے عنوان سے ایلیا اہرن برگ کا پیغام ہے، اس کے بعد مقالات، نظمیں، غزلیں اور افسانے، افسانوں کے بعد "ہماری ادبی تحریک" اور جائزے کے مستقل عنوانات ہیں۔

مقالات میں "فکر تونسوی اور فریاد" کے عنوان سے ایک تنقید شائع کی گئی ہے۔ فریاد شاد نکودری کی نظموں اور گیتوں کا وہ مختصر مجموعہ ہے جس کی اکثر نظمیں اور گیت فرقہ پرستی کے زہر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اسی فریاد پر فکر تونسوی نے مقدمہ لکھا ہے۔ آدھے سے زیادہ مضمون تو فکر صاحب کی قصیدہ خوانی میں ختم کیا گیا ہے۔ اسکے بعد بھی مقالہ نگار خاتون محض اس نتیجہ پر پہونچی ہیں کہ یہ مقدمہ فکر کو چند غیر فرقہ پرستانہ نظمیں دکھا کر لکھوا لیا گیا ہو۔ بہر حال تنقید ہلکی پھلکی ہے ضرورت اس بات کی تھی کہ فرقہ پرستی کے نفسیاتی اسباب پر روشنی ڈالی جاتی، کیوں شاد اپنے نفس سے احتساب نہیں کر سکا، آخر وہ کونسا ناسور ان کے دل میں ہے۔ جو شاد اور فکر دونوں کو اس ناعاقبت اندیشی پر مجبور کر دیتا ہے!؟

نظموں میں قمر ہاشمی کی نظم "لہو" مختصر ہے لیکن نکھرے ہوئے فکر اور روشن ذہن کا پتہ دیتی ہے ؎

لہو سفید اگر ہو تو صرف پانی ہے
رگوں میں جوش سے دوڑے تو غیر فانی ہے

"انسان پیدا ہو گیا"، تیغ الہ آبادی کی نظم اپنی ہیئت و روح کے لحاظ سے کافی دلکش...... ہے۔ ہیئت اور اسپرٹ دونوں میں وہ "قبلۂ زندان جہاں" سے مکمل طور پر اثر پذیر ہیں۔ یوں تو جوش نے اکثر نئے شاعروں کو متاثر کیا ہے لیکن خاص طور پر احسان دانش، علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی .... اس سے متاثر ہیں اس کے سائے معلوم ہوتے ہیں۔ الفاظ کی تراش، دروبست اور طنطنہ میں یہ جوش کی کامل نقل تو نہیں کر سکتے لیکن تقلید کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور یہ قدرتی چیز ہے۔ جوش نے جو ماحول اُردو شاعری میں پیدا کر دیا ہے اس سے یہ لوگ بچ نہیں سکتے۔ تیغ صاحب کا متاثر ہونا بھی قدرتی ہے۔ فارسی کی ترکیبیں، الفاظ کی تراش، طنطنہ طنز ان تمام عناصر سے وہ سو فیصدی متاثر معلوم ہوتے ہیں لیکن جوش کے فکری توازن سے انھوں نے استفادہ نہیں کیا کیونکہ ان کی نظم "انسان پیدا ہو گیا" حکیمانہ مسائل سے تعلق رکھتی ہے اسلئے اس میں فکری اور طنزی عناصر کے صحت مند امتزاج کی ضرورت تھی، اور اس ولالت کی بھی ...... جو مذہب اور ایسی ہی دوسری چیزوں پر اظہار رائے کے لئے مضبوط حربہ کا کام دے سکتی ہے۔

نظم کا عنوان اہم ہے۔ نظم میں نیا انسان نئی دنیا اور نیا نظام پیدا کرنے کا غلغلہ ہے لیکن اس کا لہجہ حکمت کے مرکز سے ہٹ کر رندی اور بہاریہ طرز بیان سی جا ملا ہے ؎

"مذہب" ستارۂ سحری تھا جو بجھ گیا"
اب آفتاب شرکِ درخشاں کی دھوم ہے"

اوّل تو "شرک" "مذہب" کی ضد نہیں، جیسے کہ "لامذہبیت" ہے۔ شرک تو مذہب ہی کا ایک تعلقہ ہے اور یہاں لامذہبیت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ دوسرا اعتراض شاعر کے اعتقاد اور انداز فکر پر ہوتا ہے کہ وہ "اشتراکیت" کو شرک جیسی مذبذب اور کمزور شے سے کیوں تعبیر کرتا ہے۔ اُسے مذہب سے افضل اور مطہّر کیوں نہیں کہتا جیسا کہ اس کا مقصود معلوم ہوتا ہے۔

چوتھے بند میں ؎

مذہب کی فرطِ شرم سے اُٹھتی نہیں نظر
بارِ اَلم سے جُھک گئی تقدیس کی کمر
منڈلا رہے ہیں باز شریعت کی لاش پر
یزداں نے مقبرے میں چھپایا ہے اپنا سر
میلادِ فتحِ حضرتِ انساں کی دھوم ہے

اس بند میں تقلیدی عنصر بُری طرح نمایاں ہوا ہے۔ یہ نفرت کا عنصر بھی مستعار ہے، لیکن اسے نظرانداز بھی کر دیا جائے تب بھی شریعت یزداں اور نیا میلادِ آدم، یہ تمام مسائل نہ قطعیت کی حد تک پہونچے ہیں اور نہ اس درجہ غیر اہم ہوئے ہیں کہ ان کے لئے یہ لہجہ استعمال کیا جائے۔

یہ حکیمانہ مسائل ہیں جن کے بارے میں فکر انسانی ہنوز شکوک کی منزل میں ہے۔ اس لئے شاعر کو اس کا حق کیونکر دیا جا سکتا ہے کہ وہ ادعائے حکمت کے باوجود ان مسائل پر غیر حکیمانہ انداز میں سوچے اور اظہار کرے۔ "میلادِ فتحِ حضرتِ انساں" کی ترکیب میں فتح حشو ہے، اور اگر لفظ فتح کو صحیح مان لیا جائے تو میلاد بیکار ہو جاتا ہے۔ لیکن بہرحال شاعر کی مراد "میلادِ انساں" ہی سے معلوم ہوتی ہے۔

اسی طرح ایک دوسرے بند میں تیغ صاحب بہت آگے نکل گئے ہیں۔ یہاں بھی میرا یہی اعتراض ہے کہ اندازِ سرخوشی اور فلسفیانہ فکر کا یہ امتزاج جائز نہیں ؎

اب سرنگوں ہے فلسفہ ہائے الٰہیّات
آمادہ خودکشی پہ ہیں کہنہ تبرّکات
اب پیشِ محکمات گریزاں ہیں ظنیات
بہتر ہیں دینیات سے آیاتِ کفریات
"قرآں" سے بڑھ کے اب "مرے دیواں" کی دھوم ہے

یہ خالص خمریاتی طرزِ فکر ہے۔ جسے فلسفہ اور تعمیری فکر سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بعد جب لوگ یہ مصرع پڑھیں گے کہ ؎

اِک سرخ انقلاب کے طوفاں کی دھوم ہے۔

تو وہ آپ کے ہم آہنگ نہیں ہوں گے، کیونکہ اس سے پہلے بند میں آپ عوام کی مغنیات کو بھڑکا چکے ہیں۔ "قرآن" اور "میرے دیوان" کا مقابلہ بھی ایک ذاتی مقابلہ ہو گیا۔ اسے نہ مقصد سے تعلق ہے اور نہ سرخ انقلاب سے اور نظم کے اختتام پر یہ شعر ؎

کہتے ہیں جس کو تیغ ہمارے دیار میں
اس مے فروش، مردِ مسلماں کی دھوم ہے

یزداں کے مقبرے میں چھپ جانے اور دینیات سے آیاتِ کفر بہتر ہو جانے، یہانتک کہ قرآن سے بڑھ کر "دیوانِ تیغ" کی دھوم ہو چکنے کے بعد اسکی گنجائش ہی کیا رہتی ہے کہ "مے فروش مردِ مسلماں" کی دھوم ہو ۔۔۔ !؟

نظم کے بعض بندوں میں توانائی ہے مثلاً یہ شعر کہ ؎

اب معجزاتِ کہنہ کے چہرے نڈھال ہیں
دنداں شکن حقیقتِ عریاں کی دھوم ہے

یا ؎

اِک جنبشِ نگاہ سے زنجیر گل گئی
زنداں میں طمطراقِ اسیراں کی دھوم ہے

اور اس توانائی سے بڑے بڑے کام لئے جا سکتے ہیں، اگر ترقی پسند شاعر فکر و احتیاط سے کام لیں۔

سرلا دیوی کا افسانہ "وہ کوکی کوئل" کا خاص کردار ایک ایسا بے کیف انسان ہے جو ظلم کے مقابلے میں دنیا کی ستم ظریفی کا زیادہ شاکی ہے اس میں سماج کی فرسودہ روایات کے بندھن توڑنے کی ہمّت نہیں ہے اور وہ جنسی محرومی کا شکار رہتا ہے۔ افسانہ توانا اور صحت مند زندگی کی عکّاسی نہیں کرتا بلکہ موت کی قنوطی قوتوں کے سایے ڈالتا ہے۔ اس طرح آنسہ رضیہ فرحت کا افسانہ "لامحدود فضا" بھی زندگی کی موجودہ منزل کا ترجمان نہیں بلکہ اِک رومانی افسانہ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرزانہ کوئی دیوی ہے جس کے نزدیک مسرتوں کی ابدی قدریں داخلی ہیں۔ اس کے باوجود اس غم کو کیا کہئے کہ وہ اپنے محبوب سے ملنے کے لئے موسیقار شہباز کے یہاں جاتی ہے اور آخر اُسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے تقدس کی عبا تار تار کی جا رہی ہے۔ مجموعی طور پر رسالہ خریدنے اور پڑھنے کے قابل ہے قیمت فی پرچہ ۶/ ملنے کا پتہ :۔ ولیل پورہ روڈ کانپور۔

ایک چھوتا خیال جو نئی راہیں نکالے گا ——— ایک ایسی بات جو دلوں میں پھانس بن کر چبھ جائے گی ——
ایک ایسی تصویر جس کی موسیقی صحیح معنوں میں جادو جگا دے گی ——
ایک ایسا فلم جو ہماری روز مرّہ کی زندگی کا عکّاس ہوگا —! —— اور ——
ایک ایسی تصویر جو شروع ہونے سے پہلے ہی ہاتھوں ہاتھ بک گئی ——
سنّی آرٹ پروڈکشنز کی صدرشک تصویر
بابُل
اداکار:- نرگس
دلیپ کمار - جیون - آمر - جانکی داس
کے علاوہ دوسرے
عکّاسی
فلی مستری
کہانی و مکالمے
عزم بازید پوری
نغمے
شکیل بدایونی
انھیں خوبیوں کی حامل ہے جسے یوسنّی اپنی انتھک کوششوں سے سالِ رواں کا قابل دید تحفہ بنانے میں دن رات ایک کر رہے ہیں
موسیقارِ اعظم نوشاد نے نئی نئی اور دلگداز طرزوں کی خاطر راتوں کی نیندیں حرام کر رکھی ہیں۔ اور یہ دونوں فنکار
سنّی اور نوشاد
"بابل" کو یقینی طور پر ایک ایسا تحفہ بنا کر پیش کریں گے جسکی یاد بھلانے پر بھی نہ بھول سکے گی
سنّی آرٹ پروڈکشنز - فیمس بلڈنگ، مہالکشمی بمبئی ۱۱

PRODUCER : HASNAN IN "DUNNYA" MOHOORAT

LATE BAI JADDANBAI WITH HER LADIES FRIENDS

NARGIS AND NEELAM

ساغر نظامی

ایک تجویز
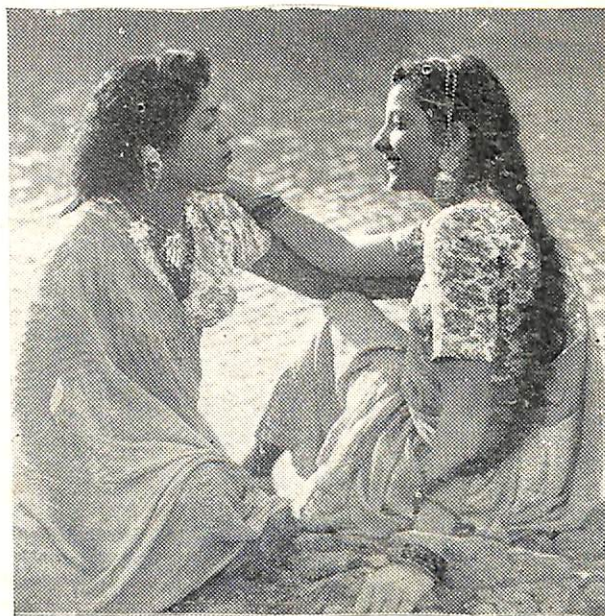
فلم انڈسٹری اور اہلِ قلم

فلم انڈسٹری میں اہل قلم کی صحیح پوزیشن سمجھنے کے لئے ہمیں ہندوستانی ڈرامہ اور اسکی ترقی و زوال پر نظر رکھنی ہوگی. جب تک اس تصویر کا پسِ منظر نہ دکھایا جائے حقیقی خط و خال نمایاں نہیں ہو سکتے۔

ابھی اُردو ڈرامہ ابتدائی منزلیں بھی طے نہ کرسکا تھا کہ فلمی صنعت نمودار ہوئی، پہلے خاموش فلمیں بنیں اس کے بعد بولتی تصویریں اور یہ بولتی تصویریں کچھ اس طرح ڈرامہ کے چہرے پر سپر امپوز ہوئیں کہ اس کے سارے خطّ و خال مٹ گئے۔

بولتی تصویروں کا گلی گلی بول بالا ہوگیا۔ اور رفتہ رفتہ تھیٹر کی پوزیشن آثار قدیمہ جیسی ہو گئی، کبھی کبھی کہیں نمائش ہوئی تو اس کا منڈپ بھی بن گیا، ورنہ کلکتہ اور بمبئی جیسے تجارتی اور بین الاقوامی شہروں سے بھی تھیٹر کا نام و نشان تقریباً مٹ سا گیا۔

ڈرامہ کے زوال سے قدرتی طور پر جہاں اداکاروں کی بیروزگاری میں اضافہ ہوا، وہاں وہ اہل قلم بھی مطلق بیکار ہو گئے جو مختلف تھیٹریکل کمپنیوں میں ڈرامہ، مکالمہ اور گانے لکھتے تھے۔ یہ تھیٹر اور اُن کے لئے ڈرامے لکھنے والے جس معیار پر بھی لیکن لکھتے تھے اور عوام کی ایک تفریحی ضرورت پوری کرتے تھے۔

فلم کمپنیوں کی طرح تھیٹریکل کمپنیوں میں بھی لکھنے والوں کی وہ قدر نہ تھی جو ہونی چاہیئے تھی، یہی وجہ تھی کہ اُس زمانے میں بھی..... اکثر اہل قلم تھیٹر کی دُنیا سے دُور رہے۔ ادب و صحافت نے صبح سویرے آنکھ کھولی تھی اور وہ اُن کے بنانے سنوارنے کی کوششوں میں لگا رہنا ہی اپنی زندگی سمجھتے تھے۔

جیسی بے اصولی اور افراتفری آج فلمی دنیا میں ہے کچھ اسی قسم کی باتیں تھیٹر کی دنیا میں بھی تھیں۔ نہ طے شدہ تجارتی اصول تھے اور نہ فن کارانہ، ادبی قدر افزائی۔ ہندوستانی تھیٹر جن لوگوں کے ہاتھ میں تھا وہ ادب سے بے بہرہ تھے اور اُن کا تجارتی نقطۂ نگاہ وہی تھا جو کارخانہ داروں کا ہوتا ہے یعنی اپنی جنس کو اہمیت دینا اور دوسرے کی جنس کو اہمیت نہ دینا۔ مزدور کی محنت سے جلبِ منفعت کرنا اور اس کی ذہانت کو بس اس قدر پنپنے دینا کہ وہ اُن کے کام آسکے۔

اسٹیج ڈرامہ کا جو ادبی و فنّی معیار تھا مجھے اسوقت اس سے بحث نہیں ہے، لیکن اہل قلم کی فنکارانہ محنت کی اقتصادی قدر کو جب میں لکھنا چاہتا ہوں تو یکایک میرے تصور کے پردے پر وہ شام تھرکنے لگتی ہے، جو میری زندگی کی دلچسپ ترین شام تھی۔

سنہ ۱۹۳۳ء کا ذکر ہے، میں کلکتہ میں مولانا ابو الکلام کا مہمان تھا عید آئی تو میں نے فیصلہ کیا کہ آغا حشر کے یہاں چلنا چاہیئے۔ چنانچہ پہونچا۔ دیکھتے ہی مجھے لپٹا لیا اور لوگوں کو یونہی چھوڑ چھاڑ کار میں بیٹھے اور ایک سمت چل دیئے۔ اس وقت ان کی خوشی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ وہ اتنی وافر تھی کہ میں اپنی مسرّت کو بھول گیا، کار ایک شاندار مکان کے سامنے رُکی۔ اور وہ مجھے اندر لے گئے اور ایک عجیب وارفتگی و معصومیت سے مکان کا ایک ایک کمرہ، ایک ایک گوشہ، ایک ایک جگہ دکھانے لگے۔

یہاں وہ اٹھتی ہے، یہاں وہ بیٹھتی ہے، یہاں وہ گاتی ہے یہاں اس کے عزیز رہتے ہیں، یہاں وہ نہاتی ہے، یہاں وہ لباس تبدیل کرتی ہے، یہاں وہ سنگھار کرتی ہے اور یہاں — وہ سوتی ہے!

یہ کہہ کر انھوں نے مسہری سے تکیہ سرا اٹھا لیا اور بولے — عجیب عورت ہے ساغر وہ! انھوں نے دبے ہوئے چند پرچے اٹھا لئے اور میری طرف انھیں بڑھاتے ہوئے عجیب انداز میں کہا اور ان کاغذوں پر میری تنخواہ گیارہ سو روپیہ کا حساب لکھتی ہے گیارہ سو لیتا ہے حشر! — اور اب وہ عاشق سے یکایک آ تنا"

ہو گئے۔ "گیارہ سو!؟ کیا ہن...... کوئی لے سکتا ہے!؟"

میں حیرت سے ان کا منہ تکنے لگا۔ گیارہ سو ــــ واقعی ــــ کیا سچ مچ صرف گیارہ "سو"!؟۔

تھیٹر کی دنیا میں اس شخص کی محنت کا معاوضہ جو خود کو ڈرامہ کا خدا کہتا تھا۔ اور اس میں شک بھی کیا ہے کہ آغا حشر نے اُردو ڈرامہ کو روایتی اور رد قیانوسی عناصر سے پاک کرکے ادب کا درجہ دیا۔ ڈرامہ نگاری کے بازار میں جو جم بھی رہا تھا اور آٹھ بھی رہا تھا اس شخص کی قیمت صرف گیارہ سو روپیہ تھی!؟ یہ پہلی اور انتہائی قیمت تھی جو سوائے آغا صاحب کے کسی کو نہیں ملی۔ یہ منفرد ذہانت کا مخصوص اور انتہائی معاوضہ تھا۔ لیکن یہ معاوضہ کتنا کم تھا، کتنا حقیر تھا۔ ایک ذہین انسان کے خلاق ذہن کا معاوضہ!؟!

اس ایک مثال سے جو سارے ماحول اور اس کی اقتصادی قدروں کو سو فی صدی چسپاں نہیں ہوتی لیکن آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ درمیانی درجے کے اہل قلم اور منشی حضرات کی تنخواہیں تھیٹر کے عہد میں کیا ہوں گی!؟ اور خاصکر ایسی حالت میں کہ تھیٹر کی تجارت ایک بے ثبات دلیسی تجارت تھی۔ لیکن بہر حال ایک خاص قسم کے لکھنے والوں کے لئے ڈرامہ ذریعۂ معاش تھا۔ جیسے ہی اس کا زوال ہوا، یہ لکھنے والے پریشانی و تباہی کی نذر ہو گئے ہاں ناطق فلم کے شروع ہوتے ہی ان کے لئے پھر کچھ گنجائشیں پیدا ہوئیں۔ اور ان کی معاش کے نئے راستے کھلے۔ پھر بھی جہاں تک مجھے علم ہے ان لکھنے والوں کی تنخواہ ۴۰، ۵۰ یا زیادہ سے زیادہ سَو سے اوپر نہیں ہوتی تھی۔ وہ وقت ہی دوسرا تھا، ماحول ہی جُدا تھا، تھیٹر کی ابھی ترتیب و تہذیب نہیں ہو پائی تھی کہ فلم آرٹ کی بنیاد رکھی جانے لگی۔ اور اس بنیاد کے لئے جس قسم کا ساز و سامان ہاتھ آتا گیا ماحول اسے قبول کرتا چلا گیا۔ لیکن جہاں تک اُن ہندوستانی اہل قلم کا تعلق تھا جو ادب و صحافت میں خاص درجہ رکھتے تھے۔ وہ فلم کی طرف رجوع نہیں ہوئے۔ تھیٹر سے آئے ہوئے اہل قلم ہی نے یہ کاروبار سنبھالا، جن کو ان کی محنت کا خاطر خواہ معاوضہ نہیں ملتا تھا۔ اور ان کی فن کارانہ اور سوشل حیثیت بھی تسلیم نہیں کی جاتی تھی۔ بس "منشی جی" ان کی سب سے بڑی تعریف تھی اور یہ غریب منشی جی نہ فلم سے کوئی گہرا رابطہ رکھتے تھے نہ اُردو شاعری سے، نہ اُردو ادب سے، ادبی دنیا اور انکی بستی کے درمیان ایک خلیج حائل تھی۔ اس بستی کے رہنے والے پروڈیوسر اور ڈائرکٹر اس موٹی اور آہنی دیوار کو نہیں سمجھتے تھے جو ان کے اور اُردو ادب کے درمیان کھڑی تھی۔ وہ تو یہی سمجھتے تھے کہ منشی جی جس وضع قطع کے ہیں اسی وضع قطع کے اُردو شاعر ہوتے ہوں گے، اُردو کہانی لکھنے والوں کی شاید یہی صورت ہوگی اور جیسی یہ کہانی لکھتے ہیں ویسی ہی کہانی وہ لکھتے ہوں گے اور جیسی یہ شاعری کرتے ہیں، ویسی ہی شاعری وہ بھی کرتے ہوں گے۔ اور جیسے یہ "نیاز مند" ہیں ویسے ہی دیوار کے اُس پار بھی ہوں گے!؟

پریم چند کی آمد

یہ احساسات اور تصوّرات تھے جن کی بھیڑ میں پریم چند فلمی دنیا میں آئے۔ ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے، بڑی مجبوریوں سے آئے، بڑی امیدوں کے ساتھ آئے۔ لیکن بڑی بیزاری کیساتھ وہ اس دُنیا سے لوٹ بھی گئے۔

پریم چند کے آنے کا کچھ اثر ہوا ہو یا نہ ہوا ہو لیکن اتنا ضرور ہوا کہ ان اہل قلم کی جھجک نکل گئی جو ادب و صحافت کی دنیا میں مصروفِ کار تھے اور جو اپنی ادبی شہرت کے مقابلے میں فلم میں آنے کو ایک "فعلِ مذموم" سمجھتے تھے۔

ایسا نہیں تھا کہ پریم چند سے پہلے کچھ جرنلسٹ اور افسانہ نگار فلمی دنیا میں موجود نہیں تھے۔ خواجہ احمد عباس، سعادت حسن منٹو، اور کئی اصحاب آچکے تھے، بالآخر ۱۹۴۳ء میں جوش ملیح آبادی اور میں نے فلم لائن میں قدم رکھا۔ اس کے بعد تو راہ بالکل صاف تھی۔ کرشن چندر، راما نند ساگر، شکیل، نخشب، میراجی، اختر الایمان، راجہ مہدی علی خاں، اوپندر ناتھ اشک، قمر جلال آبادی، نیپالی، بھگوتی چرن ورما، خمار بارہ بنکوی اور راجندر سنگھ بیدی، اور ابراہیم جلیس، غرضکہ ادیب اور شاعر کارواں در کارواں فلم کی دنیا میں داخل ہوئے۔

بمبئی کے علاوہ لاہور میں شوکت تھانوی، ظہیر کاشمیری، اور دوسرے شاعروں اور ادیبوں نے فلم میں شرکت کی۔ ایک عام رجحان پیدا ہو گیا، وہ حجابات یک لخت اُٹھ گئے جو فلم لائن اور اہل قلم کے درمیان پڑے ہوئے تھے۔

یہ تبدیلی بڑی ارتقائی تھی، گانوں کے الفاظ بدلے، دھنیں بدلیں، مکالموں کی زبان بدلی، رنگ بدلا، ایک عجیب انقلاب پیدا ہوا، اس میں شک ہی کیا ہے کہ چند ہی برسوں میں فلمی دنیا میں بہت

کچھ تبدیلی ہوتی۔ ادیبوں اور شاعروں کے اس طرح فلم میں آنے کو ایک نئے معاشی اور صناعتی (آرٹسٹک) دور کا آغاز کہنا چاہئے۔ ادب اور صحافت کے بعد ایک تیسرا ماحول بنا جہاں شعر و ادب کی معاشی قدروں کے نئے سانچے ڈھلنے لگے۔ اور عوامی طور پر شعر و ادب کے جوہر نمایاں ہونے کا امکان پیدا ہوا۔

لیکن فلم کے اس انقلاب سے عوام اور خود ادیبوں کو جس تبدیلی اور ترقی کی امیدیں تھیں وہ کچھ زیادہ پوری نہیں ہو سکیں آنے والے ادیبوں اور شاعروں کو جلد ہی معلوم ہو گیا کہ بڑی کٹھن راہ ہے اور اصلاح و ترقی کی بہت کم گنجائشیں ہیں، لیکن اب وہ آ چکے تھے، ادھر ماحول سے ان کی ٹکریں بھی ہوئیں اور ان ٹکروں کے باوجود ان پر یہ روشن ہو گیا کہ فلم ایک طے شدہ معاشی ذریعہ ہے جو دوسرے ذرائع کے مقابلے میں بے ثبات ہی سہی مگر زندگی کی ضرورتوں کی پشت پناہی کر سکتا ہے۔ ماحول سے انکی ٹکر کے کیا اسباب ہیں؟

فلم کا حقیقی ماحول

ان اسباب کو دریافت کرنے کے لئے ماحول کو سمجھنے کی ضرورت ہے، فلم ساز ادارے جو ابھی تک اقتصادی اور اخلاقی طور پر ادیب اور شاعر کی قدروں سے ناواقف تھے، نو دس سال پہلے... جس قسم کے افراد سے واسطہ رکھتے تھے۔ میں بتا چکا ہوں اور آج بھی انڈسٹری کا جو کچھ ڈھانچہ ہے۔ اس کی بنیاد سرمایہ داری' اور قطعی سرمایہ دارانہ مفاد پر ہے۔ ظاہر ہے کہ منفرد سرمایہ دارانہ مفاد کی موجودگی میں شاعر اور فن کار کی حیثیت ایک بے بس مزدور سے زیادہ نہیں، اور مزدوروں کی یہ بے بسی اور بھی بڑھ جاتی ہے جب خود مزدوروں کی بہتات ہو جائے۔!؟

بہت سے نئے آنے والے ادیبوں اور شاعروں نے ماحول سے سمجھوتہ کیا، بہت سوں کو شخصی پشت پناہی حاصل ہو گئی، کئی اپنی جودت سے اس دنیا میں پامردی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں۔ لیکن زیادہ تر ایسے ہیں جنھیں ذیل کے دل شکن تجربے ہوئے ہیں۔

(۱) یہ کہ وہ فلم کو ذہنی و سماجی ترقی کا ذریعہ نہیں بنا سکتے اور اگر انھیں اپنی معاش فلم سے حاصل ہی کرنی ہے تو سو فیصدی "ایکٹریس" "کھڑکی" "شہنائی اور" روشنی" جیسی تصویریں لکھنے کے لئے انھیں پروڈیوسروں اور ڈائرکٹروں سے تعاون کرنا ہوگا۔

(۲) زندگی کے ہر شعبے میں علم و فن اور صنعت و صناعت کی کچھ معیّنہ قدریں ہیں اور انھیں کی بنا پر ہر فنکار، شاعر و ادیب سے معاملہ کرنا ایک موٹا سا تجارتی اصول ہے، لیکن فلم لائن میں اس اصول پر عمل نہیں کیا جاتا۔ اس کی وجہ ہے اوّل تو ماضی کے اہل قلم کی روایتیں دھندلی نہیں پڑی ہیں۔ دوسرے بڑی تعداد میں ایسے اہل قلم بھی موجود ہیں۔ جن کا لکھنا پڑھنا فلم ہی سے شروع ہوتا اور فلم ہی تک محدود رہتا ہے، معاشی اور اقتصادی طور پر وہ کسی بھی سطح پر آ کر فلم ساز اداروں سے معاملہ کر لیتے ہیں —— یہ انکی کوئی ارادی حرکت نہیں ہے بلکہ وہ اپنے حالات سے مجبور ہیں، معاشی کشمکش سے آزاد ہونے کے لئے وہ نازک احساسات کی خلیج کو تیزی سے عبور کرنے کے لئے مجبور ہیں۔

فلم ساز اداروں اور ڈائرکٹروں، پروڈیوسروں کو ایسے آدمی چاہئیں جو ان کے نظریوں، خیالات اور خاص کر ان کی "انا" سے (جس کی مضبوط نفسیاتی بنیادیں ہیں) نہ ٹکرائیں، بلکہ ان کے جذبۂ "انا" کو غذا بہم پہنچائیں، اس کے ساتھ ہی سب سے کم سرمایہ کہانی، مکالموں، اور گانوں پر صرف ہو لیکن اہل قلم زیادہ سے زیادہ اپنی قوتیں ان کے ساتھ کام کرنے میں صرف کر دیں۔

عام حیثیت تو کسی بات کو بھی نہیں دی جا سکتی۔ کیونکہ اچھے اور بُرے انسان ہر دنیا میں ہوتے ہیں، لیکن وہ جو طے شدہ تجارتی اصول اور مسلّمہ انسانی طور طریق ہیں، ان طریقوں کی بنیادوں پر فلمی دنیا کا کاروبار نہیں چلتا۔ اہل قلم سے معاملت کا بھی کوئی اصول نہیں ہے اور اس لئے نہیں ہے کہ قابلیت کی بنیاد پر کوئی معاملت نہیں ہوتی۔ حادثہ کے طور پر ہوتی ہے۔ سفارش اور رحم کے طور پر ہوتی ہے۔ اس لئے اہل قلم کوئی اصول قائم نہیں کر سکتے۔ زندگی عام انسان کی طرح اُن پر ہر وقت حملہ آور رہتی ہے۔ ان کی ساری قوتیں مقابلہ کرنے میں صرف ہو جاتی ہیں اور مقابلہ کا ذریعہ ان کے پاس ایک ہی ہے کہ وہ فلم ساز اداروں کے سامنے سپر انداز ہو جائیں۔ اور نابینا اتفاق کے طور پر نام نہاد ترقی کے جو مواقع انھیں مل رہے ہیں ان سے کسی نہ کسی طرح فائدہ اٹھائیں۔

شعراء کا حالِ زار

افسانہ نگار، سینیریسٹ اور مکالمہ نویسوں کے علاوہ

شعراء کی ایک بڑی تعداد فلم میں داخل ہو چکی ہے۔ شروع شروع میں جب مشاہیر شعراء فلم میں آئے تو حالات بالکل مختلف تھے۔ جذبۂ احترام اور مادّی قدر نے اک فضا پیدا کر دی تھی، روایتی فلمی شعرائے عظام کو اپنی شہرت کا قائم رکھنا مشکل ہو گیا تھا۔ لیکن جلد ہی یہ فضا اور اس کے اثرات وائپ ([illegible]) ہو گئے، اور رفتہ رفتہ نئے آنے والے شعراء کی شخصیتیں بالکل بے نور و بے کشش ہو کے رہ گئیں۔ یہانتک کہ "سنتوشی" عہد شروع ہو گیا۔ اس کے بعد تو یہ شعراء بالکل فیڈ آؤٹ ہی ہو گئے۔

یہ مرحلہ بھی انصاف طلب اور غور کے قابل ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ آنے والے شاعروں نے ماحول کا صحیح مطالعہ نہیں کیا، وہ اپنی قوتوں کا اندازہ.... کرنے کی طرح نہ کر سکے اور اپنے جذبۂ انا کے استعمال میں تو وہ بالکل ہی بہک گئے۔

عوام کے محبوب

وہ عوام و خواص کے محبوب شاعر ضرور تھے لیکن عوام سے ان کی کوئی تاجرانہ معاملت نہیں تھی وہ معاوضہ کے بغیر عوام و خواص کو اپنے آرٹ سے مستفیض کرتے تھے اور عوام اس عطا کا جواب اپنی بے لوث محبت کی صورت میں دیتے تھے۔ یہ معاملت بڑی حد تک روحانی معاملت تھی۔ لیکن غور کیا جائے تو اس معاملت کے نیچے اقتصادی خواہشات کا مواد بھی موجود تھا۔ اگر یہ مواد موجود نہ ہوتا تو عوام کے محبوب کبھی عوام سے اپنا رشتہ نہ توڑتے۔ ان اقتصادی خواہشات کو میں غیر فطری قرار نہیں دیتا بلکہ قطعی فطری سمجھتا ہوں۔ عوام ان خواہشات کو محض اس لئے اہمیت نہیں دیتے کہ وہ شاعر کو صدیوں کی مشرقی روایات کی وجہ سے مادّی ضرورتوں سے مستغنی اور بلند سمجھتے ہیں۔ وہ آج بھی یہ خیال کرتے ہیں کہ میر و نظیر کی روح مُردہ نہیں ہوئی ہے۔

فلم میں آنے والے شاعر بھی اسی ترنگ میں آئے، وہ شاعروں کے عوام، یوپی اور شمالی ہند کے اعلیٰ و متوسط طبقے کے خواص کی والہانہ ادب پرستیوں کے رنگ سے رچے ہوئے تھے۔ اس ماحول میں انھیں ایک پُر فریب اندازہ ہوا تھا کہ "آرٹسٹ کا سرمایہ اور اس کی جاگیر صرف اس کا آرٹ ہے"، اور اسی بنیادوں پر سماج ان سے مساوی بلکہ کہیں کہیں مساوات سے بلند واسطے رکھتا ہے۔ لیکن جب وہ فلم میں آئے تو انھیں تجربہ ہوا کہ وہ تو "زیرو" ہیں۔

ان کے اور فلمی بورژوازی کے درمیان "آرٹ" کوئی مضبوط رشتہ ثابت نہیں ہو سکتا، ہاں اگر موج آئے تو بک سکتا ہے۔ وہ بھی موج شرط ہے۔ !؟

خلاؤں، فضاؤں اور آسمانوں میں اڑنے والے ان فنکاروں کا یہ تجربہ زمانہ کی تبدیلیوں نے اور بھی سنگین کر دیا۔ اور اس احساس کے بعد ان کے پاس صرف ایک راہ باقی رہ جاتی ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح ماحول سے ساز کریں۔ اس کوشش میں ان کی رہی سہی جاذبیتیں اور بھی فنا ہو گئیں، اب حال یہ ہے کہ ان کے ساتھ انڈسٹری کا وہی سلوک ہے جو ادنیٰ درجہ کے حاجت مند "بھکاریوں" کے ساتھ ہو سکتا ہے۔

گانوں کی تقسیم

پہلے پہل ایک تصویر کے دس گانوں کی تقسیم تنوع پیدا کرنے کی ایک اُپج قرار دے کر اختیار کی گئی تھی۔ اور اب وقت اور حالات کے تقاضوں نے اسے "ضرورت" بنا دیا ہے۔ دس گیت دس شاعروں کو تقسیم کئے جاتے ہیں۔ اُن سے کوئی تحریری معاہدہ نہیں کیا جاتا، کسی وعدہ کا پاس نہیں کیا جاتا، کسی حفظِ مراتب کو پیشِ نظر نہیں رکھا جاتا، اس ایک گانے کو لکھوانے کے لئے ہر قسم کا اختیار پروڈیوسر اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور یہ دس شعراء جنھیں دس گیتوں کی بھیک دی جاتی ہے آپس میں اس درجہ مختلف اور ایک دوسرے کے مفاد اور فن کارانہ یگانگت و اخلاق سے اس درجہ بعید ہوتے ہیں کہ اس ذلت و نقصان کا اندازہ بھی نہیں کرتے جو اختلاف اور دوری سے پیدا ہوتا ہے!

یہ تو ان کا ذکر ہے جو سفید پوش بھی ہیں، فلم سازوں سے تعلقات بھی رکھتے ہیں، شہرت بھی رکھتے ہیں اور ادب و عوام میں ان کی ایک جگہ بھی ہے۔ لیکن سینکڑوں ایسے اہل قلم ہیں جنھیں ان کے حالات نے ان خصوصیات سے محروم رکھا ہے۔ لیکن اُن میں بڑی اہلیتیں ہیں اور اگر انھیں موقع دیا جائے تو وہ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔

ان اہل قلم کی حالت اور بھی خراب ہے، ان بے چاروں کی تو کوئی بات بھی نہیں پوچھتا کیونکہ اونچے آستانوں تک ان کے قدم تو کجا سر بھی نہیں پہونچ سکتا۔ لوگ ان سے سیدھے منہ بات نہیں کرتے اور اتفاق سے کہیں کوئی موقع نصیب بھی ہوتا ہے تو کوڑیوں

کے مول ان کی محنت کو خرید لیا جاتا ہے۔ بعض کام لینے والے انھیں "ٹکر" لینے والوں سے بہتر و مناسب سمجھتے ہیں۔ کیونکہ یہ اہل قلم اُن سے سو فیصدی تعاون کرنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں۔ لیکن آگے ہیں کہ اس قسم کا تعاون اصلاحی و تنقیدی ذہن کی راہ میں نہایت مضر ثابت ہوتا ہے اور دوسروں کو کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

اشتراک و اتحاد کی کمی

اور یہ تمام حالات مختلف گوشوں میں اُس بے ربطی، پریشانی اور بے تعلقی سے پیدا ہوئے ہیں جو یہ محسوس نہیں ہونے دیتی کہ وہ ایک دوسرے کی راہ میں کانٹے بو رہے ہیں۔ فلم میں کام کرنے والے شاعروں اور ادیبوں میں اشتراک و اتحاد کی افسوسناک حد تک کمی ہے۔ میرے خیال میں یہی کمی ان کا اصلی مرض ہے جو گھن کی طرح انھیں کھائے جا رہا ہے اور انھیں کسی صحیح مرکز تک پہونچنے نہیں دیتا۔

اگر یہ واقعہ ہے اور یقیناً ہے کہ معاشی یا اصلاحی کسی خیال سے بھی انھیں فلم انڈسٹری میں کام کرنا ہے تو انھیں انڈسٹری کے حال و مستقبل پر گہری نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اپنی حیثیت کا حقیقی اندازہ کرنے کی ضرورت ہے اور فلم انڈسٹری سے اپنے تعلقات کو سائنٹفک بنیادوں پر استوار کرنا لازمی ہے۔

(۱) فلم انڈسٹری چھوٹے درجے کی صنعت ہے جس کا دو باتوں سے دوچار ہونا یقینی ہے یا تو یہ قومی بنا دی جائے گی یا اپنے موجودہ مرکز سے ترقی کی طرف جست کرے گی، لیکن بہرحال دونوں صورتوں میں بڑے پیمانے پر نئے تعمیری منصوبوں کے ابلاغ و اظہار کا ذریعہ ضرور بنے گی۔ قومی ضرورتوں کے لحاظ سے اُسے پھیلنا اور تبدیل ہونا پڑے گا۔ ظاہر ہے کہ ہر تبدیلی و وسعت کے ساتھ اس کے ٹیکنیشنز، فنکاروں اداکاروں اور اہل قلم کی قدر و قیمت بھی بڑھتی جائے گی۔

اس لئے ضرورت ہے کہ اس سے تعلق رکھنے والے تمام مزدور اپنی حیثیت کو اجتماعی طور پر مضبوط کریں۔ خاص کر اہل قلم جن کا "جذبۂ انا" انھیں ٹکم سے تو زیادہ قریب رکھتا ہے۔ لیکن وہ یہ سمجھنے سے گریز کرتے ہیں کہ ان کی حیثیت موجودہ نظام میں عام "مزدور" سے مختلف نہیں ہے۔

اگر وہ فلم انڈسٹری سے اپنے تعلق کو ذی اثر اور مضبوط بنانا چاہتے ہیں تو انھیں اپنی حیثیت جلد معلوم کر لینی ہوگی اور بچاؤ کے وہی طریقے اختیار کرنے ہوں گے جو اس نظام میں عام مزدور اختیار کرتے ہیں، ورنہ وہ اپنے اور دوسرے ہم فن افراد کے لئے قیامت تک کوئی سازگار فضا پیدا نہیں کر سکیں گے۔ چند افراد کی کامیابی یا ایک دو اہل قلم کے پروڈیوسر ہو جانے سے فلم میں ادب و شاعری کی قدر قائم نہیں ہو سکتی۔ فلم کے معیار پر بھی اس انفرادی کامیابی کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ظاہر ہے جو ادیب یا شاعر پروڈیوسر بننے میں کامیاب ہو جائے گا۔ اس کا نقطۂ نگاہ تعمیری و اصلاحی نہیں رہ سکتا۔ وہ "کھڑکی" کے بدلے "جھروکہ" بنائے گا۔ اس کی گردن اقتصادی بوجھ سے ٹوٹ رہی ہوگی۔ سب سے پہلے وہ اپنی گردن سیدھی کرے گا۔ سب سے پہلے وہ یہ چاہے گا کہ ایسی باتیں اختیار کرے جو لاکھوں روپیہ لا سکیں، سب سے پہلے وہ اہل قلم سے ویسا ہی ہو جائے گا جیسے کہ اس کے پیش رو ہیں۔ اس لئے ایک کی کامیابی جماعت کی اقتصادی فلاح کا سبب کبھی نہیں بن سکتی۔

فلاح اتحاد کے بغیر ممکن نہیں، ذہنی اتحاد نہیں عملی اتحاد، میں جب اس قسم کے اتحاد کا تصور کرتا ہوں تو مجھے سب سے پہلے ایک ایسی انجمن کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جس کی پہلی خصوصیت ایک مرکز پر تمام اہل قلم کا اجتماع ہو (ان اہل قلم کے اجتماع سے مراد ہے جو فلم میں کام کرتے ہیں) یہ انجمن ہندی اور اردو کے اہل قلم تک محدود بھی ہو سکتی ہے۔ اور اس میں گجراتی اہل قلم بھی شریک ہو سکتے ہیں، اگر شریک ہوں تو زیادہ بہتر ہے۔

ایک ایسی انجمن کے اغراض و مقاصد تفصیل کے ساتھ پیش کرنا اس مضمون کا مقصود نہیں لیکن میں یہاں صرف ان باتوں کی طرف اشارہ کروں گا جن کی بنیادوں پر اس انجمن کو قائم ہونا چاہئے۔

(۱) فلم ساز اداروں کے کام میں آسانی، ترقی اور اہل قلم کی تنظیم اس انجمن کا بنیادی مقصد ہونا چاہئے۔

(۲) یہ انجمن گجراتی، ہندی اور اُردو کے شاعروں، افسانہ نگاروں اور لیکھکوں پر مشتمل ہونی چاہئے۔

(۳) اس کی رکنیت امیر و غریب، مشہور و غیر مشہور اہل قلم کے لئے عام ہونی چاہئے اور ہر طبقاتی احساس سے آزاد!

(۴) اس انجمن کا فرض ہونا چاہئے کہ یہ اپنے ممبروں کی مدد سے ایک جمہوری فنڈ جمع کرے تاکہ بیکاری کے موقعوں پر حاجت مند

۱۰۹

اہلِ قلم کو قرض دے سکے اور جسے اہلِ قلم اِک معیّنہ مدّت میں واپس کردیا کریں۔

(۵) اس انجمن کا فرض ہونا چاہیئے کہ یہ بیکار اہلِ قلم کو باکار بنانے میں امداد دے۔

(۶) انجمن کی طرف سے ایک ماہنامہ اُردو، ہندی اور گجراتی میں شائع ہونا چاہیئے۔ جس کے مقاصد میں فلم اور اس کے تمام متعلقات سے بحث کرنا اور معلومات بہم پہونچانا شامل ہو، اپنے اراکین کی خوبیوں اور اہلیتوں کو اُجاگر کرنا بھی اسی کا مقصد ہونا چاہیئے۔

(۷) اسی ماہنامہ کو فلمی کہانی لکھنے کے طریقوں، اسکرین پلے رائٹنگ اور سینوریو وغیرہ کی تعلیم کا ذریعہ بنایا جائے۔

(۸) انجمن کو چاہیئے کہ اہلِ قلم کو دو طبقوں میں بانٹ دے اور ان کے کام کی قدر و قیمت مقرر کرے۔ ایسا کرنا اس لئے ضروری ہے کہ نئے آنے والے اہلِ قلم فلم کی تیکنیک سے ناواقف ہوں گے اور کچھ زمانہ انھیں تیکنیک جاننے پر صرف کرنا ہوگا۔

(۹) انجمن کو اہلِ قلم کی ذہنی کاوشوں یعنی، کہانی، مکالموں، گانوں اور سینوریو کی قیمتیں مقرر کرنی چاہئیں اور اس کے ساتھ ہی اُن میں وہ اخلاق پیدا کرنا چاہیئے کہ وہ انجمن کے ڈسپلن کو بہر حال قائم رکھیں اور مقررہ قیمتوں سے ایک پائی کم اور زیادہ معاوضہ پروڈیوسروں سے وصول نہ کریں۔

(۱۰) انجمن کو اہلِ قلم اور پروڈیوسروں کے باہمی تعلقات کو مضبوط بنانے کے ذرائع تلاش کرنا چاہئیں۔

میرا خیال ہے کہ اگر تجویز کی مد نمبر ۴ پر سنجیدگی سے عمل کیا گیا تو اہلِ قلم انجمن کے مقاصد اور نظام کے مطابق ضرور کام کرسکیں گے۔

یہ اور اس قسم کے دوسرے اغراض و مقاصد انجمن کی بنیاد قرار دیئے جانے چاہئیں اور کسی صورت میں بھی اسے پروڈیوسروں یا فلم ساز اداروں کے خلاف محاذ کی شکل نہیں دینی چاہیئے۔ کیونکہ اس انجمن کا مقصد اہلِ قلم کی تنظیم و تعمیر ہوگا نہ کہ کسی کی تخریب، اگر اس قسم کی کوئی انجمن قائم کرنے میں اہلِ قلم کامیاب ہوگئے تو یہ نہ صرف ان کے مسائل حل کرنے میں مدد دیگی بلکہ فلم ساز اداروں کے لئے بھی مفید ہوگی۔ اور ان بے اصولیوں کا خاتمہ ہو جائے گا جو اہلِ قلم پروڈیوسروں سے اختیار کرتے ہیں۔

میری رائے میں اس انجمن کا نام "سینے رائٹرز ایسوسی ایشن" ہونا چاہیئے۔

یہ ایک سرسری تجویز ہے جسے عملی صورت دینے کے لئے ضروری قدم اٹھانا چاہیئے۔ لیکن کامیابی اسوقت تک ممکن نہیں ہے جب تک اہلِ قلم "انفرادیت" کے جال سے آزاد نہ ہوجائیں۔

اگر انھوں نے اپنی ذات سے ہٹ کر عام اہلِ قلم کی زبوں حالی اور پستی کو محسوس کیا تو وہ اس تجویز کے متعلق سوچ سکتے اور عمل کرسکتے ہیں۔

محترمہ جدّن بائی کا انتقال

ابھی چندر موہن اور ڈکشٹ کے غم میں آنکھیں آنسوؤں سے خشک نہ ہوئی تھیں کہ جدّن بائی کی المناک موت نے تمام انڈسٹری کو ہلادیا محترمہ گوناگوں خصوصیات اور کمالات کا مجموعہ تھیں۔ وہ اپنی ذات سے خود ایک انسٹی ٹیوشن تھیں، ان کی موت صرف انکی موت نہیں ان کے عہد کی موت ہے'——— موسیقی میں ان کا درجۂ کمال، سخن شناسی میں ان کا مخصوص مقام، ادب و شاعری میں ان کا ذوقِ صحیح، فلم آرٹ کے متعلق ان کا ریع صدی کا فنکارانہ تجربہ' ادب پرستی، فنکار نوازی، سماج میں ان کا بین الاقوامی میل جول اور ہر قوم اور ہر طبقے میں ان کے وسیع تعلقات و اثرات اس کے ساتھ ہی مجلسی اطوار و آداب میں ان کی ایک تکمیلی شان، یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ اپنی ذات سے خود ایک انجمن تھیں۔ جس طرح زندگی کا چکّر ماضی کی طرف نہیں چل سکتا اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ انڈسٹری ... اِن صفات کی کوئی دوسری خاتون پیدا کرسکے، ان کی موت صرف ان کی موت نہیں ایک تمدّن کی موت ہے۔

صبر تو قدرت کا جبر ہے، اس کی تلقین سنگدلی اور زمانہ سازی ہے، انفرادی غم کا اظہار بھی کوئی بلندی نہیں۔ اختر، انور اور نرگس کے غم میں کوئی حصّہ گیر ہوسکے!؟ یہ ناممکن ہے۔ لیکن ہاں ان کی جامع الصفات ماں کی موت نے ہزاروں دلوں کو بے چین کردیا ہے ——— انکی موت انڈسٹری کا ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ ہماری دعا ہے کہ صبر سے زیادہ قدرت اختر، انور اور نرگس کو ہمّت و استقلال دے کہ وہ موصوفہ کے چھوڑے ہوئے ادھورے کاموں کو پورا کریں۔ ہمارے لئے یہ غم کوئی معمولی غم نہیں ہے لیکن غم سے گذر جانا ہی انسان کی بڑائی ہے

ساغر نظامی

——— ماہنامۂ ایشیا۔ جولائی ۴۹ء

ہندوستان میں فلم کی رفتار

شاہین پکچرز ـــ اوّلین شاہکار "کھیل"

بمبئی میں جو ہندوستانی فلمی صنعت کا مرکز ہے۔ نئے فلم ساز ادارے مضبوط بنیادوں پر قائم ہو رہے ہیں، گرمئی بازار روزانہ بڑھ رہی ہے۔ مضبوط مالی وانتظامی بنیادوں پر حال ہی میں جو فلم ساز ادارے قائم ہوتے ہیں، اُن میں "شاہین پکچرز" نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔

یہ ادارہ پروڈیوسر ڈائرکٹر ایس، ایم، نواب رئیس اعظم گیا نے پروڈیوسر ڈائرکٹر اختر حسین کے تعاون سے قائم کیا ہے جس نے تیزی سے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ کھیل کا افسانہ' مشہور افسانہ نگار اور سینو ریسٹ، ڈائرکٹر ضیا سرحدی کی فکر رسا کی تخلیق ہے، جو اپنی جدّت، دلکشی اور تاثیر کے لحاظ سے چوٹی کا افسانہ ہے۔ گانے ہندوستان کے مشہور شعراء علاّمہ آرزو لکھنوی، حضرت ساغر نظامی، حضرت بہزاد لکھنوی، شمس عظیم آبادی اور کئی دوسرے شعراء کی مخصوص توجہ کا نتیجہ ہیں۔ اور گانوں میں سجّاد کی موسیقارانہ نزاکتوں اور نزہتوں نے ایسی نشیلی ساحرانہ مہک بھر دی ہے کہ انسان شکار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

"کھیل" میں دیوآنند حفیظ جہاں، نگار سلطانہ اور مراد خاص رول ادا کر رہے ہیں۔ فلمی دنیا میں ایس۔ ایم۔ نواب کی شرکت اور اختر حسین کے تعاون نے انڈسٹری میں پھر ایک نیا باب کھولا ہے اور ماحول پھر نئی امیدوں اور توقعات سے معمور ہو گیا ہے۔ ایس، ایم نواب شاہین پکچرز کے پروڈیوسر اور ڈائرکٹر اپنے اطوار اور ذہنی افتاد کے لحاظ سے کافی ترقی پسند اور عملی نوجوان ہیں۔ آرٹ کے متعلق ان کا نقطۂ نگاہ سجیل اور بلند ہے۔ اس لئے یہ توقع غلط نہیں کہ کھیل فنّی اعتبار سے کامیاب ترین تصویر ہوگی۔ جہاں تک اداکاروں کے انتخاب، شاعری، کہانی اور موسیقی کا تعلق ہے۔ ضیا سرحدی، سجّاد، آرزو، ساغر شمس اور دوسرے نام اس بات کی ضمانت ہیں کہ کھیل تمام خوبیوں کا ایک، ایسا امتزاج ہوگا جو عوام کو متاثر کئے بغیر نہیں رہے گا۔

ان محاسن کے ساتھ جب اس کی تیاری میں اختر حسین جیسے تجربہ کار ڈائرکٹر کے مشورے شریکِ حال ہیں تو "کھیں" کی بلند معیاری اور کامیابی میں کوئی شک باقی نہیں رہ جاتا۔

راج رتن پکچرز :۔ "کنبہ"

ایک قطعی نئی سمت میں تخلیق و ترقی کی نئی کوششیں ہو رہی ہیں، اس جماعت کا خیال ہے کہ وہ از سرِ نو اس امر کا تجربہ کرے گی کہ فلم آرٹ عوام کے ذوق؛ اور شعر و ادب کا ایسا موزوں اور کارگر میل کس طرح پیش کیا جا سکتا ہے جو انڈسٹری میں "آدرش" کی حیثیت اختیار کر جائے۔

یہ کوششیں پروڈیوسر فرامرز بہرام شا اور نرگس آرٹ کنسرن کے میل جول اور تعاون کے ذریعہ ہو رہی ہیں۔ راج رتن پکچرز کی سب سے پہلی تصویر "کنبہ" تین دماغوں کے سوچ وچار سے ایک ایسی چیز بن رہی ہے جو کئی نازک سماجی اور گھریلو مسائل کا حل پیش کرے گی۔

یہ تین دماغ رنجیت کے مشہور ڈائرکٹر رمن بی ڈیسائی مسٹر کیشوری پٹیل بی، اے، ایل ایل بی اور مشہور ترقی پسند ادیب و شاعر ساغر نظامی ہیں۔

ساغر نظامی جنہوں نے اس سال کی کامیاب ترین فلم "سنگھار" کے مکالمے لکھ کر انڈسٹری میں اپنی ذہانت و قابلیت کا سکّہ جما دیا ہے اپنی پوری توجہ کنبہ کے مکالمے اور گانے لکھنے پر صرف کر رہے ہیں۔ کاغذی تیاریاں تقریبًا مکمل ہو چکی ہیں۔ گانے موسیقار کے ذہن و فکر میں اپنی دھنوں کا تانا بانا بن رہے ہیں ـــ کاسٹ کا انتخاب ہوتے ہی رمن ڈیسائی تصویر کا مہورت کر دینگے۔ ڈرامیت کے ساتھ ساتھ فلمی افسانے کو زندگی سے کتنا قریب ہونا چاہئے کنبہ کی کہانی اور اس کا نازک ٹریٹ مینٹ اس سوال کا عملی جواب ہوگا۔

پاکستان میں فلمی جدوجہد

یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ فلمی صنعت کے معاملے میں پاکستان اور ہندوستان ایک دوسرے سے گہری معاملت کر رہے ہیں، پاکستان کے ڈسٹری بیوٹر ہندوستانی فلم ساز اداروں کی بہت سی تصویریں حاصل کر چکے ہیں۔ اس سلسلہ میں الحاج ملک شریف نے مغربی پاکستان کے لئے کلدیپ پکچرز کی "ناچ" ورما فلمز کی "پتنگا" پاپولر انڈیا پروڈکشنز کی "ماں کا دل" اور ان تصویروں کے علاوہ محبوب کی شاہکار تصویر "انداز" بھی حاصل کر لی ہے۔

قیصر سینما زندگی کی نئی تازگی اور کشش سے دلکشی کا مرکز بن رہا ہے۔ مشینری سے لے کر ساز و سامان تک بدلا جا رہا ہے۔ یہ آثار ایک نوزائیدہ ملک کے لئے جمالیاتی ترقی کی بڑی پُر امید نشانی ہے کہ اُسے آرٹ کا اس طرح اور اس قدر احساس ہو۔

نیو ایورشائن پکچرز

مسٹر حلیم جن کا پرتو آج بھی دلوں پر کبھی نہ مٹنے والے نقش کی طرح موجود ہے۔ پاکستان کی صنعت فلم سازی کے ارتقاء کے لئے دل و جان سے کوشش کر رہے ہیں۔ فلم ساز اداروں اور ڈسٹری بیوٹرز کے باہمی مفادات سے قطع نظر یہ عزمِ بلند اور ذوقِ عمل فلمی صنعت کے غیر معمولی ارتقاء کا نشان ہے، اس نشان کو بلند کرنے میں جن شخصیتوں کا ہاتھ ہے اُن میں مسٹر حلیم کافی ممتاز ہیں۔

شوکت حسین رضوی

شوکت جدوجہد کی کس منزل میں ہے؟ — ہم اس سے پہلے لکھ چکے ہیں۔ فلم کی تمام مشینری لاہور پہنچ چکی ہے اور اب صرف اسٹیڈیو کا مسئلہ حل ہونا باقی ہے۔ اسٹیڈیو ملنے کی سفارشیں چاروں طرف سے ہو رہی ہیں۔ سینما ایسوسی ایشن نے بھی شوکت ہی کی تائید میں فیصلہ کیا ہے۔ یہ فیصلہ اس لئے برمحل اور صحیح ہے کہ پاکستان میں سب سے پہلا شخص شوکت ہی ہے جس کے پاس زمانۂ حال کی بہترین فلمی مشینری ہے۔ جو کافی سرمایہ خرچ کر کے یورپ و امریکہ سے منگائی گئی ہے۔

اوّل تو اسٹیڈیو کے متعلق جگہ اور تمام آسانیاں حکومت کو دینی چاہئیں، لیکن ایسا نہ ہو سکے تو یہ آسانیاں پاکستان کے خواص کی طرف سے شوکت کو ملنی چاہئیں۔ بہرحال جو بھی یہ آسانیاں دے سکا وہ گویا فلم کی ترقی و توسیع کی بنیادی اینٹ رکھیگا۔

مُندری

اُردو کے علاوہ پنجابی زبان میں تصویروں کا آغاز بہت پہلے ہو چکا ہے۔ صوبجاتی زبانوں اور ان کے کلچر کی اس طرح نمائش ہو تو بُرا بھی کیا ہے۔ "مُندری" ایورنیو پکچرز کی دلنواز پیشکش ہے جسے داؤد چاند نے ڈائرکٹ کیا ہے۔ اس میں ہند اور پاکستان کے مشہور اداکاروں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں، راگنی۔ اختری۔ ایم اسمٰعیل۔ غلام۔ مایا دیوی۔ الیاس کاشمیری۔ سلیم رضا۔ زینت۔ شاہ جی۔ اور طرحدار چارلی۔

"مُندری" کے پروڈیوسر جی اے گل ہیں۔ اور گانوں کی سحر آفریں دھنیں چشتی صاحب نے بنائی ہیں۔

ایورنیو پکچرز۔ ایبٹ آباد روڈ۔ لاہور

نگینہ

پاکستان کی تازہ ترین فلمی خبروں میں یہ خبر بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ شوکت حسین رضوی نے اسٹیڈیو کا انتظار نہیں کیا اور امریکہ سے آئی ہوئی مشینری کو اپنی کوٹھی "شیش محل" میں فٹ کر لیا ہے اس انتظام کے بعد انھوں نے "نگینہ" کی شوٹنگ شروع کر دی ہے۔ اس فلم کو وہ آؤٹ ڈور شوٹنگ سے ہی مکمل کرنا چاہتے ہیں۔

"غلط فہمی" پنچولی آرٹ پکچرز کی نئی فلم "غلط فہمی" کو مغربی پنجاب کے سنسر بورڈ نے پاس کر دیا ہے اس فلم کے مخصوص فنکار آشا پوسلے، نذر اور اشما دیوی اور احمد اکبر، اجمل کی ہیں۔ اسے ڈائرکٹ کیا ہے۔

ٹیلیگرام
پیپر پورٹ
ٹیلیفون
۲۱۹۳۱
کاغذ
بونڈ پیپر
لیجر پیپر
آرٹ پیپر
پوسٹر پیپر
ریپنگ پیپر
بینک پوسٹ پیپر
جلیٹنگ پیپر
پرنٹنگ گلیز
نیوز پرنٹ
نیوز گلیز
بٹر پیپر
ٹیسو پیپر
آرٹ کارڈ
فلنٹ پیپر
امیٹیشن پیپر
کریپ پیپر
ایلمونیم فوئلس
ایلمونیم
کرافٹ پیپر
کوٹیڈ پیپر
وغیرہ وغیرہ
آرٹ بورڈ
اور
بورڈس
قائم شدہ سنہ ۱۸۹۰ء
عبداللہ بھائی فدا علی اینڈ کو پیپر مرچنٹ ۲۴ ستار چال بمبئی ۲

Regd. No. B. 3543.

Printed and Published by ...ghar Nizami at Metro Printing and Litho Works, Byculla Club, Bellasis Road, Bombay 8, and Published at 7A Court Royal Christ Church Road, Bombay 8.